

شبلی اور جہان شبلی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

شبلی اور جہان شبلی

بسم الله الرحمن الرحيم

شبلی اور جہان شبلی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ادبی دائرہ اعظم گڑھ

© مصنف

(سلسلہ مطبوعات ادبی دائرہ نمبر ۱۶)

نام کتاب :	شبلی اور جہان شبلی
مصنف :	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
ناشر :	مصنف
مطبع :	اصیلہ پریس، دہلی
طبع اول :	اپریل ۲۰۱۵ء
صفحات :	۲۰۸
قیمت :	Rs:250/-

ملنے کے پتے

- ادبی دائرہ غلامی کا پورہ، عقب آواس وکاس اعظم گڑھ، ۲۷۶۰۰۱
- دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، شبلی روڈ، اعظم گڑھ، یو پی، ۲۷۶۰۰۱

Email: azmi408@gmail.com - Mob: 9838573645

www.drmiiazmi.webs.com

گرا می قدر

ڈاکٹر ابرار اعظمی

کی نذر

نہاں ہے جس کی محبت میں رنگ محبوبی

ترتیب

۷	دیباچہ
۱۱	۱ علامہ شبلی اور اسلامی اقدار کا تحفظ
۲۳	۲ علامہ شبلی کا نظریہ تاریخ
۳۵	۳ علامہ شبلی کے تعلیمی افکار کی تشکیل میں کارفرما عناصر
۴۳	۴ علامہ شبلی کی ملی دردمندی (اردو شاعری کے حوالے سے)
۵۲	۵ مراسلات شبلی: ایک مطالعہ
۸۱	۶ ظفر حسن ایک اور تصانیف شبلی کے انگریزی وتر کی تراجم
۸۶	۷ علامہ شبلی اور لسان الصدق
۱۱۶	۸ علامہ شبلی اور الہلال
۱۲۸	۹ علامہ شبلی اور البلاغ
۱۳۲	۱۰ علامہ شبلی اور زمیندار
۲۰۷	کتابیات

دیباچہ

مطالعات شبلی پر ایک صدی سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے، علامہ شبلی کی کثیر الجہات شخصیت اور ان کے لازوال کارناموں کے تعارف و تجزئے پر مشتمل پچاسوں کتابیں اور سیڑوں مضامین و مقالات قلم بند کئے جا چکے ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایک ایک پہلو پر کئی کئی مطالعے سامنے آچکے ہیں تاہم ان کی شخصیت کے ایسے پہلو اور گوشے اب بھی سامنے آجاتے ہیں جو بالکل اچھوتے اور لائق مطالعہ و تجزیہ ہوتے ہیں۔ اسے علامہ شبلی کی گونا گوں اور ہشت پہل شخصیت کا طلسم ہی کہا جاسکتا ہے۔

علامہ شبلی کا دائرہ کار بے حد وسیع اور متنوع ہے۔ علم و ادب، شعر و نقد، تاریخ و سیاست، تعلیم و تدریس، سیرت و سوانح، کلام و عقائد ان کے بنیادی موضوعات تصنیف و تالیف تھے۔ علاوہ ازیں ملی دردمندی اور مسلمانان عالم کے لئے جدوجہد گویا ان کے خون میں شامل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دائرہ کار میں وسعت اور نیرنگی پیدا ہوتی چلی گئی اور انہوں نے ملت کے لئے ایسے لازوال کارنامے انجام دئے جس کی داستان مستقل کتابوں کے علاوہ معاصر رسائل و جرائد کے صفحات میں بھی محفوظ ہے۔ زیر نظر کتاب ”شبلی اور جہان شبلی“ میں اس نوع کے چند مطالعے و تجزئے بھی شامل ہیں۔

یہ کتاب میری مستقل تصنیف نہیں بلکہ چند مقالات کا مجموعہ ہے جو مختلف وقتوں میں لکھے گئے اور بعض سمیناروں میں پیش کئے گئے۔ جن کی تعداد دس ہے۔

علامہ شبلی کی ذات میں مذہبی حمیت و غیرت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ اسلام اور اسلامی اقدار و روایات پر کسی قسم کا حملہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ کتاب کے پہلے مقالہ میں اسی حمیت و غیرت کے زیر اثر لکھی جانے والی ان کی تحریروں کا ذکر و تجزیہ ہے۔

علامہ شبلی نہ صرف ایک عظیم مورخ تھے بلکہ ایک خاص فلسفہ تاریخ کے واضح و نقاد بھی تھے۔ ایک مقالہ میں ان کے فلسفہ تاریخ کا تجزیہ ہے۔ اور انہوں نے تاریخ نویسی کے لئے جن اصول و نظریات کی نشاندہی کی ہے ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہ مقالہ ماہنامہ معارف نومبر ۱۹۹۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔

تیسرا مقالہ ”علامہ شبلی کے تعلیمی تصورات کی تشکیل میں کارفرما عناصر“ جامعۃ الفلاح کے دوروزہ قومی سمینار میں پیش کیا گیا تھا۔ اس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ علامہ شبلی کے نظریہ تعلیم کے بنیادی عناصر کیا تھے اور کن اسباب و عوامل کے زیر اثر ان کا نظریہ تعلیم قائم ہوا۔

چوتھا مقالہ علامہ شبلی کی ملی درد مندی رابطہ ادب اسلامی کے سمینار منعقدہ مدرسہ دینیہ غازی پور میں پڑھا گیا تھا اس میں ان کے ملی جذبات کی مرقع کشی ان کی شاعری کے حوالہ سے کی گئی ہے۔ یہ مقالہ مختلف رسائل میں شائع ہو چکا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی نے خطوط کے علاوہ رسائل و جرائد میں وقتاً فوقتاً مراسلات بھی لکھے تھے جن کی معلوم تعداد ۲۴۷ ہے۔ ان کی طرف اب تک کسی اہل علم نے توجہ نہیں کی تھی۔ ایک مقالہ میں پہلی بار ان کا تعارف و تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ مراسلات مختلف علمی، دینی، قومی اور ملی منصوبوں پر مشتمل ہیں اس لئے ان سے علامہ شبلی کے متعدد علمی منصوبوں سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ یہ مقالہ شبلی صدی بین الاقوامی سمینار میں پیش کیا گیا تھا اور ماہنامہ معارف کے ”شبلی نمبر“ میں شائع ہو چکا ہے۔

ظفر حسن ایک نے ترکی میں بیٹھ کر الفاروق اور سیرۃ النبی کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور اسی ترجمے سے اولاً ان کتابوں کا ترکی زبان میں ترجمہ ہوا، اس کی تفصیلات بھی پہلی بار اس کتاب میں پیش کی جا رہی ہیں۔

ایک اور مقالہ ”علامہ شبلی اور لسان الصدق“ بھی شامل اشاعت ہے جو انجمن ترقی اردو ہند کے ترجمان سہ ماہی اردو ادب دہلی کے اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۳ء کے شمارہ میں شائع ہو چکا ہے، جسے اہل علم و ادب نے بے حد سراہا اور راقم کو سو سال بعد علامہ شبلی سے متعلق لسان الصدق کے مشمولات سے آگاہ کرنے پر مبارکباد پیش کی۔

یہ مقالہ اردو ادب دہلی میں چھپا تو ایک اہل قلم نے اس کے مواد اور مشمولات کا سرقہ کر لیا اور پانچ ماہ بعد بڑی شان سے اسے اپنی تحقیق بنا کر پیش کیا اور الزام دوسرے کے سر عاید کر دیا تا کہ خود ان کی کارستانی پر پردہ پڑ جائے:

خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو

سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر

الہلال، البلاغ اور زمیندار کے مطالعے پر مشتمل مقالات خاص اسی مجموعہ کے لئے لکھے گئے ہیں اور غیر مطبوعہ ہیں۔ ان مقالوں میں شبلی شناسی کے متعدد نئے پہلو اور نئے گوشے حتیٰ کہ شبلی کی بعض نئی تحریریں خطوط، مراسلات اور بعض نئے خیالات سامنے آئے ہیں، جن کا اس سے پہلے کی تصنیفات و تالیفات میں ذکر تک نہیں ملتا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مقالات علامہ شبلی کی شخصیت کے حوالہ سے بعض نئی دریافتوں اور نئے سلسلوں پر مشتمل ہیں۔

علامہ شبلی نے ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو انتقال کیا تو علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی، پروفیسر سید نواب علی اور بعض دیگر ابا و شعرا نے قطعہ تاریخ وفات، لوح مزار اور تعزیتی نظمیں لکھیں جسے مولانا ظفر علی خاں نے روزنامہ زمیندار لاہور میں بڑے اہتمام سے شائع کیا، انہیں زمیندار کے حوالہ سے یکجا کر دیا گیا ہے۔

تعزیتی نظموں کے ساتھ وہ مختصر مضامین جو بطور تعزیت زمیندار میں شائع ہوئے تھے افادیت کے پیش نظر انہیں بھی جمع کر دیا گیا ہے۔ علامہ شبلی کی مشہور کتاب سیرۃ النبی سے متعلق زمیندار میں جو مراسلات چھپے انہیں بھی یکجا کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح علامہ شبلی کی وفات پر ملک کے مختلف علاقوں لاہور، لکھنؤ، میرٹھ، راولپنڈی، بارہ مولہ اور رگون وغیرہ میں جو تعزیتی جلسے ہوئے ان کی تفصیلات بھی جمع کر دی گئی ہیں۔ غرض علامہ شبلی کے حوالہ سے زمیندار میں جو کچھ شائع ہوا تھا اسے مرتب انداز میں پیش کر دیا گیا ہے۔ اس میں یقینی طور پر بعض نئی معلومات آگئی ہیں جنہیں شبلیات میں ایک اہم اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

ماہنامہ لسان الصدق ڈاکٹر عبدالقوی و سنوی اور ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری کی بدولت اور الہلال و البلاغ پروفیسر محمود الہی کی کوششوں سے دوبارہ شائع ہو گئے ہیں، البتہ روزنامہ

زمیندار بالکل نایاب ہے۔ ہندوپاک کے چند کتب خانوں میں اس کی متفرق جلدیں اور چند شمارے اگرچہ محفوظ اور دستیاب ہیں تاہم ان کا حصول تقریباً ناممکن ہے۔ میں جناب پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب اور جناب امجد سلیم علوی صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ ان حضرات نے زمیندار میں علامہ شبلی سے متعلق شائع شدہ مواد فراہم کیا جس سے راقم کو ایک طویل مقالہ لکھنے میں کامیابی ملی۔ یہ مقالہ لکھتے ہوئے یہ نکتہ پیش نظر تھا کہ زمیندار میں جو کچھ بھی علامہ شبلی سے متعلق شائع ہوا ہے اسے پیش کر دیا جائے تاکہ دریافت شدہ مواد ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے۔

میری علمی زندگی کی یہ بتیسویں اور شبلی شناسی کے سلسلہ کی نویں پیش کش ہے۔ اس سے پہلے متعلقات شبلی، کتابیات شبلی، شبلی سخنوروں کی نظر میں، مکتوبات شبلی، آثار شبلی، شبلی کی نام اہل علم کے خطوط، شبلی شناسی کے سوسال اور شذرات شبلی مختلف اداروں دارالمصنفین اور ادبی دائرہ وغیرہ سے شائع ہو چکی ہیں جنہیں اہل علم اور ارباب کمال نے نہ صرف سراہا بلکہ انہیں حوالہ کی کتب قرار دیا ہے۔ امید ہے یہ نئی پیش کش بھی قابل قدر ٹھہرے گی۔

میرے محسن اور کرم فرما جناب ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی مدظلہ کو میرے علمی کاموں سے جس قدر دلچسپی ہے کسی اور کو نہیں ہو سکتی، اس کتاب سے بھی انہوں نے بڑی دلچسپی لی، اللہ تعالیٰ انہیں صحت و تندرستی کے ساتھ اچھا رکھے اور ان کا سایہ شفقت دراز فرمائے۔

محمد الیاس الاعظمی

رفیق اعزازی

دارالمصنفین اعظم گڑھ

۲۰ مارچ ۲۰۱۵ء

علامہ شبلی اور اسلامی اقدار کا تحفظ

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) نے ۵۷ سال کی عمر پائی، ۱۹ سال تحصیل علم میں صرف ہوئے۔ دو سال کشمکش میں گزرے۔ بقیہ ۳۶ سال علم و تحقیق، تصنیف و تالیف، درس و تدریس اور قومی خدمت میں بسر کئے۔ اس علمی زندگی کا بیشتر حصہ اسلامی اقدار و روایات کے تحفظ میں لگایا۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام اور اسلامی اقدار و روایات کے تحفظ کے لئے انہوں نے مدۃ العمر جدوجہد کی اور اس کے لئے طرح طرح کے منصوبے اور خاکے بنائے اور ان خاکوں میں رنگ بھرنے میں اپنی تمام صلاحیتیں لگا دیں۔

عہد شبلی اس لحاظ سے خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس میں اسلام، اسلامی علوم و فنون اور شعائر اسلامی پر ہر طرف سے حملے ہو رہے تھے۔ عیسائی، مشنری، پادری، آریہ، ہندو اہل قلم اور سب سے بڑھ کر مستشرقین یورپ اسلام پر حملہ آور تھے اور انتہائی سرگرمی کے ساتھ وہ اپنے مشن میں لگے ہوئے تھے۔ ان کے لغو، بے بنیاد، ناروا اور رکیک الزامات اسلام اور اسلامی اقدار و روایات کی تصویر مسخ کر رہے تھے۔ ان کی پردہ دری اور جواب کے لئے جو شخصیت سب سے پہلے میدان میں آئی وہ علامہ شبلی کی ذات گرامی تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:

”ایسے ہوش مند حریفوں کے مقابلہ کے لئے ساری دنیائے اسلام میں سے جو شیر دل اسلام کی صف میں سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلی ہی تھے۔ جنہوں نے انہی کے طریقے سے انہی کے اسلوب پر ان کو جواب دینا شروع کیا اور بتایا کہ اسلام کے فیض و برکت کی فرح بخش ہواؤں نے دنیا کے علوم و تمدن کی بہاروں کو کیسے دو بالا کیا اور یونانیوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے مردہ علوم میں کیونکر اپنی محنتوں اور تحقیقوں سے جان ڈالی۔“

(حیات شبلی ص ۱۶-۱۷ طبع جدید)

پہلی جدوجہد ترکی کا تعاون

علامہ شبلی کے حالات میں اسلامی اقدار کے تحفظ کے لئے جس پہلی جدوجہد کا ذکر ملتا ہے وہ خلافت اسلامیہ ترکی کا تعاون ہے۔ علامہ شبلی کا آغاز شباب تھا، وہ تازہ تازہ تعلیم سے فارغ ہوئے تھے۔ اسی زمانہ (۱۸۷۷ء) میں روس نے روم پر حملہ کر دیا جس نے دنیاۓ اسلام میں اک آگ سی لگا دی۔ چاروں طرف خلیفہ سلطان عبدالحمید خاں کی فتح و نصرت کی دعائیں مانگی جانے لگیں۔ زنجیوں کے لئے تعاون کا سلسلہ شروع ہوا اور ہر طرف خلیفہ کی حمایت میں زور و شور سے تقریریں ہونے لگیں اور تحریریں لکھی جانے لگیں اور تمام عالم اسلام سراپا جوش بن گیا۔ اس کی خبریں اعظم گڑھ بھی پہونچیں، چنانچہ خلافت کے تعان کے لئے یہاں بھی ایک کمیٹی قائم ہوئی۔ علامہ شبلی اس کے سکریٹری نامزد ہوئے چنانچہ انہوں نے بڑی تندہی کے ساتھ چندہ جمع کیا اور تین ہزار کی رقم جمع کر کے ترکی سفیر مقیم بمبئی حسین حبیب آفندی کے ذریعہ دار الخلافہ قسطنطنیہ روانہ کیا۔ یہ علامہ شبلی کا پہلا قومی کام تھا۔

الجزیرہ

۱۸۸۳ء میں علامہ شبلی علی گڑھ کالج سے وابستہ ہوئے تو ایک نئی دنیا سے متعارف ہوئے۔ یہاں اور بہت سی باتوں کے ساتھ انہیں اس بات سے بھی آگاہی ہوئی کہ اسلام اور اسلامی اقدار و روایات پر یورپ بالخصوص مستشرقین کے کیا اعتراضات ہیں اور اسلام کے بارے میں ان کا زاویہ نظر کیا ہے۔

یہاں جس بات نے انہیں اولاً سب سے زیادہ متاثر کیا وہ مسلمان بادشاہوں پر جزیہ کے بے جا استعمال کا الزام تھا۔ اعتراض یہ تھا کہ مسلمان بادشاہوں نے اپنی غیر مسلم رعایا سے جبری جزیہ ٹیکس وصول کیا اور یہ دراصل انہیں مسلمان بنانے کا ایک ذریعہ تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے علامہ شبلی نے رسالہ الجزیرہ لکھا اور مضبوط دلائل سے ثابت کیا کہ یہ الزام بالکل لغو اور بے بنیاد ہے۔

جز یہ مسلمانوں کا ایجاد کردہ ٹیکس بھی نہیں بلکہ اسے نو شیرواں نے قائم کیا تھا جسے مسلمانوں نے اپنے زمانہ میں باقی رکھا اور یہ کوئی ظلم و جبر بھی نہیں بلکہ ایک معمولی سا ٹیکس تھا جس سے خواتین، بچے، اپانچ، معذور وغیرہ سرے سے بری تھے۔ یہ ٹیکس ان غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا تھا جن کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری مسلمانوں پر عائد ہوتی تھی اور جو فوجی خدمت انجام نہیں دے سکتے تھے، چنانچہ غیر مسلموں نے جب بھی فوجی خدمت انجام دی ان سے جزیہ وصول نہیں کیا گیا۔

کتب خانہ اسکندریہ

عیسائی مورخین کی طرف سے حضرت عمرؓ پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ انہوں نے کتب خانہ اسکندریہ کو جو بطلموسیوں کی یادگار تھا جلا کر خاک کر دیا۔ یہ اتنا بڑا الزام تھا کہ اسے ہر عیسائی مورخ دہراتا تھا، اس کے پس پشت دراصل یہ ثابت کرنا تھا کہ مسلمان علم دشمن ہیں اور انہیں علم سے کوئی سروکار نہیں۔

علامہ شبلی نے اس الزام کا جائزہ لیا تو اس نتیجے پر پہونچے کہ یہ سراسر کذب و افترا ہے۔ کتب خانہ اسکندریہ توفیق مصر سے پہلے خود عیسائیوں نے برباد کر دیا تھا اور اس کی بربادی میں عیسائیوں کے بڑے بڑے مذہبی رہنما بھی شریک تھے۔ علامہ شبلی نے اپنے موقف کی تائید میں بڑے مضبوط اور مستحکم دلائل پیش کئے ہیں۔ اور ثابت کیا ہے کہ یہ الزام قطعی درست نہیں۔

حقوق الذمیین

مخالفین اسلام کا ایک بہت بڑا اعتراض یہ تھا کہ مسلمان بادشاہوں نے اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ بڑا ظلم روا رکھا اور ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ یہاں تک اسلامی حکومت میں انہیں عام حقوق زندگی بھی حاصل نہیں تھے۔ چنانچہ علامہ شبلی نے ان مفروضہ مظالم کا جائزہ لیا اور واضح کیا کہ اسلام نے اپنی غیر مسلم رعایا یعنی ذمیوں کو جو حقوق دئے وہ تمام تر عدل و انصاف مبنی ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کی بلندی تک یورپ کی سلطنتوں کے عدل و انصاف کا پر پر واز اب تک نہیں پہونچا۔

الانتقاد

عیسائی مورخ جرجی زیدان نے کئی جلدوں میں اسلامی تاریخ و تمدن کی تاریخ سپرد قلم کی جس میں بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے بہ ظاہر عرب خلفاء کے محاسن لکھے لیکن درحقیقت ان کے معائب کا ایک دفتر تیار کیا، چنانچہ اس کی بڑے زور و شور سے تشہیر کی گئی اور اس کے ترجمے کئے گئے۔ اس کے جواب کے لئے ساری دنیائے اسلام سے علامہ شبلی ہی کا قلم نیام سے باہر آیا اور الانتقاد لکھ کر انہوں نے اس کا بھرپور جواب دیا اور اس کے تارپود کو بکھیر دیا۔ جرجی زیدان کو مخاطب کر کے انہوں نے بڑے جذباتی انداز میں لکھا ہے کہ:

”اے جرجی زیدان کیا یہ بات میرے لئے پسندیدہ ہو سکتی ہے کہ تم میری تو تعریف کرو اور عرب کی مذمت کرو، ان کو اپنے تیروں کا نشانہ بناؤ اور ہر قسم کا عیب و شران کی جانب منسوب کرو اور ان کی مجد و شرافت کو پارہ پارہ کر دو، کیا میں یہ برداشت کر سکتا ہوں کہ تم بنو امیہ کو محض ان کے خالص عرب ہونے کی بنا پر بدترین مخلوق سے تعبیر کرو اور ان کے بارے میں یہ کہو کہ وہ بد معاملہ، فسادی اور لٹیروں تھے۔ خانہ کعبہ کے ڈھانے والے اور قرآن کا مذاق اڑانے والے تھے۔ کیا یہ بات میرے لئے قابل ضبط ہو سکتی ہے کہ تم کتب خانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کی نسبت حضرت عمرؓ کی ذات گرامی کی طرف کرو جن کے عدل و انصاف کی گواہی زمین و آسمان دیتے ہیں اور یہ بات بھی کم تکلیف دہ نہیں ہے کہ تم خلفائے عباسیہ کی تعریف محض اس وجہ سے کرتے ہو کہ تمہارے خیال میں انہوں نے عربوں کو ذلیل و رسوا کیا، یہاں تک کہ ان کو کتوں کی صف میں کھڑا کیا اور یہ بات ضرب المثل بن گئی اور یہ کہ خلیفہ منصور عباسی نے خانہ کعبہ کی تحقیر کے جذبہ سے قبۃ خضر کی تعمیر کرائی اور حریمین کی تذلیل کی خاطر اس نے وہاں کا غلہ روک دیا اور مامون نزول قرآن کا منکر تھا اور معتصم نے سامرا میں ایک کعبہ بنوایا تھا جس

کے ارد گرد طواف کی جگہ اور منی و عرفات کے نام سے مقامات بنوائے۔“

(الانتقاد ص ۲)

یہ اور اس طرح کے متعدد الزامات کا انہوں نے قدرے تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور جرجی زیدان کے تعصب، الزام تراشی اور کذب و افترا کو نہ صرف واضح کیا ہے بلکہ ایک ایک کی تردید و تصحیح بھی کی ہے۔

وقف علی الاولاد

انگریز جج قانون وقف علی الاولاد کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اپنی اولاد پر وقف کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے، چنانچہ وہ عدالتوں میں وقف علی الاولاد کے مقدمات میں اسلامی قانون کی خلاف ورزی کرتے تھے جس کی وجہ سے متعدد وقف املاک برباد ہو گئیں اور غیروں کے ہاتھوں میں چلی گئیں۔ علامہ شبلی اسے مسلمانوں کا بہت بڑا ضیاع تصور کرتے تھے، چنانچہ انہوں نے وقف علی الاولاد کو تسلیم کرانے کی غرض سے ایک بڑی تحریک کا آغاز کیا اس سلسلے میں انہوں نے انتہائی جدوجہد سے کام لیا، ہندوستان کے تمام ممتاز قانون دان اور بیرسٹر سے خط و کتابت کی، ان کا تعاون اور تائید حاصل کی، پھر رسالہ وقف علی الاولاد لکھا جس میں وقف علی الاولاد کو قرآن و حدیث اور فقہاء کے آراء و خیالات کی روشنی میں ثابت کیا، اس کی تائید میں علماء و فقہاء کے دستخط حاصل کئے، پھر انہیں کی روشنی میں محمد علی جناح نے اسے دستور ساز اسمبلی میں پیش کر کے قانونی شکل میں پاس کرایا۔ اس طرح انہیں ایک بڑے ملی مسئلہ اور اسلامی قدر کے تحفظ میں کامیابی ملی۔

اوقاف اسلامی

وقف علی الاولاد میں کامیابی کے بعد انہیں عام اوقاف اسلامی کے تحفظ کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ اس کے لئے بھی انہوں نے جدوجہد کا آغاز کیا اور سب سے پہلے ایک مراسلہ لکھ کر تمام ہمدردان ملت کی توجہ ادھر مبذول کرائی۔ انہوں نے لکھا کہ:

۱- ایک موریل تیار کیا جائے جس میں انتظام اوقاف کی خواہش

گورنمنٹ سے کی جائے اور اس موریل پر اس کثرت سے مسلمانوں کے ہر طبقہ سے دستخط کرائے جائیں کہ یہ موریل تمام قوم کی طرف سے سمجھا جائے۔

۲۔ گورنمنٹ سے جس قسم کی نگرانی کی خواہش کی جائے، اس طریقے کی ہو کہ مذہبی دست اندازی کا کسی طرح احتمال پیدا نہ ہونے پائے مثلاً اس کا یہ طریقہ ہو کہ ایک کمیٹی قائم کی جائے جس کے ارکان تمام صوبوں سے نیا بتانہ طریقے پر انتخاب کیے جائیں اور انتخاب کی تمام کارروائی صرف اسلامی جماعت کی طرف سے انجام پائے، پھر گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ اس کمیٹی کو باقاعدہ تسلیم کرے اور اس کو باضابطہ اختیارات تحقیقات وغیرہ کے دئے جائیں، پھر اس کی مرتب کردہ رپورٹ ملک میں شائع کی جائے اور گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ اس کے مطابق عمل کیا جائے۔

۳۔ تیوری سلطنت میں تمام اوقاف کے انتظام کا ایک خاص عہدہ تھا، جس کو صدر الصدور کہتے تھے، کیا گورنمنٹ سے یہ درخواست نہیں کی جاسکتی کہ یہ عہدہ دوبارہ پھر قائم کیا جائے، لیکن صدر الصدور کا تقرر اسی نیا بتانہ اصول پر اسلامی جماعت کی طرف سے ہو، تاکہ گورنمنٹ کے متعلق کسی قسم کی دست اندازی کا احتمال نہ پیدا ہو سکے، ان کے علاوہ اور جو تجویزیں آپ کے خیال میں آئیں آپ تجویز فرمائیں۔ (مقالات شبلی ج ۸ ص ۳۵)

چونکہ یہ کام انہوں نے اپنے اخیر دور زندگی میں شروع کیا اور محض ۱۰ ماہ بعد وفات پائی اس لئے یہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

تعطیل جمعہ

جمعہ کے دن سرکاری عدالتوں کے کھلے رہنے سے مسلمان ملازمین کو نماز جمعہ ادا کرنے میں دشواری ہوتی تھی، علامہ شبلی کو وقف علی الاولاد میں کامیابی ملی تو انہیں خیال پیدا ہوا کہ اگر اسی

طرح تعطیل جمعہ کے لئے تحریک چلائی جائے تو کامیابی یقینی ہے، چنانچہ انہوں نے تعطیل جمعہ کے لئے بھی جدوجہد شروع کی۔ سب سے پہلے ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ لکھنؤ ۱۹۱۲ء میں رزولوشن پیش کیا جو منظور ہوا۔ اس کے بعد ایک یادداشت مرتب کی جس میں بہ دلائل ثابت کیا کہ مسلمانوں کا یہ مطالبہ حق بجانب ہے۔ انہوں نے اس کے درج ذیل وجوہ لکھے ہیں:

- ”۱۔ انگلش گورنمنٹ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ رعایا کے تمام مختلف مذاہب کو آزادی دیتی ہے کہ وہ باطمینان تمام اپنے اپنے فرائض مذہبی کو بجالائیں۔
- ۲۔ جمعہ کی نماز ہر مسلمان پر جو معذور و مجبور نہ ہو فرض قطعی ہے۔
- ۳۔ چنانچہ جمعہ کی فرضیت کا حکم قرآن پاک میں مذکور ہے۔
- ۴۔ اس نماز کی اہمیت کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام اسلامی سلطنتوں اور ریاستوں میں اس دن تعطیل ہوتی ہے۔

۵۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں اکثر ہندو ریاستوں میں بھی باوجودیکہ وہاں مسلمان ملازموں کی تعداد نسبتاً کم ہے اس دن تعطیل ہوتی ہے۔

۶۔ انگریزی عملداری کے شروع میں چونکہ مسلمانوں کو یہ خیال تھا کہ انگریزی حکومت ایک غیر حکومت ہے، وہ ہمارے مذہبی فرائض کا لحاظ کیوں کرنے لگی اس لئے انہوں نے اس درخواست کی ہمت نہیں کی لیکن بعد کو مسلمانوں کو انگریزی حکومت کی انصاف پسندی کا جیسے جیسے تجربہ ہوتا جاتا ہے ان کی یہ خواہش بڑھتی جاتی ہے کہ وہ اس ضروری فرض کے ترک کی طرف گورنمنٹ کو متوجہ کریں۔

۷۔ آئندہ جیسے جیسے تعلیم بڑھتی جائے گی، مسلمان سرکاری ملازموں کی تعداد بھی بڑھتی جائے گی اور اسی مناسبت سے نماز جمعہ کی تعطیل کا مسئلہ بھی روز بروز اہم ہوتا جائے گا۔“

(مقالات شبلی ج ۸ ص ۲۹)

اس یادداشت کی روشنی میں ایک انگریزی میموریل تیار کیا گیا تاکہ اس پر تمام مسلمانوں سے دستخط کرایا جاسکے، اسی زمانہ میں گورنمنٹ بنگال نے نماز جمعہ کے لئے دو گھنٹہ کی رخصت منظور کی۔ چنانچہ علامہ شبلی نے اگرچہ اسے ایک مثبت پہلو قرار دیا تاہم وہ چاہتے تھے کہ

دو گھنٹہ اور وقتی رخصت کے بجائے آدھے دن کی چھٹی ہونی چاہئے۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی:

”گورنمنٹ بنگال تمام مسلمانوں کے شکریہ کی مستحق ہے کہ اس نے نہایت فراخ دلی سے مسلمانوں کی اپیل نہایت توجہ سے سنی اور مسلمان سرکاری ملازموں کو جمعہ کے دن دو گھنٹہ کی رخصت عطا کی۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ رعایت ادائے مذہبی فرائض کو دیکھتے ہوئے کافی ہے لیکن اس طرفدارانہ انتظام میں ایک خطرہ ہے جو تمام اہل اسلام کے خوف کا وجہ ہو سکتا ہے۔ خاص کر اس خطرہ کا اثر سب آرڈینیٹ (ماتحت اسامیاں) پر پڑتا ہے، خطرہ یہ ہے کہ بہت سے افسر ایسے بھی ہوں گے جو ایسے مسلمانوں کو اپنی ماتحتی میں لینا ناپسند کریں گے جو ہر جمعہ کو دو گھنٹہ کے لئے کام چھوڑ کر چلے جایا کریں گے اور یوں کہ ایسی آسامیاں جیسے تجویز نویس، محرر، نقل نویس وغیرہ وغیرہ ایسے ہی افسروں کے ہاتھ میں ہوتی ہیں اس لئے یہ خوف پیدا ہوتا ہے کہ ایسی آسامیوں پر مسلمانوں کے مقابلہ میں جو دو گھنٹہ کے لئے چلے جایا کریں گے، غیر مسلمان ملازمین کو ترجیح دی جائے گی جو ہر روز اور ہر وقت ان کے ساتھ کام کریں گے، اگر اس خطرہ کی کوئی اصلیت ہو سکتی ہے تو ایسے طرفدارانہ انتظام سے مسلمان سرکاری ملازمتوں کی آئندہ امیدوں اور ترقیوں پر سخت اثر پڑے گا۔

لہذا حضور والا کے ملتزمین یہ تجویز کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ جمعہ کے دن نصف دن کی تعطیل ایک بجے سے اس ضرورت کے لئے کافی ہوگی۔ (مقالات شبلی ج ۸ ص ۳۵)

ابھی یہ تمام کارروائیاں پوری بھی نہیں ہو سکی تھیں کہ علامہ شبلی نعمانی نے انتقال کیا۔

حفاظت و اشاعت اسلام

۱۹۰۸ء میں شدھی تحریک کے زیر اثر راجپوتانہ اور بعض دوسرے علاقوں میں نو مسلموں

کے دوبارہ ہندو ہونے کی خبریں ملیں، علامہ شبلی اس خبر سے تڑپ اٹھے۔ چنانچہ اس کے انسداد و تدارک کے لئے انہوں نے شاہ جہاں پور، رائے بریلی اور کانپور وغیرہ کا دورہ کیا۔ راجپوتانہ میں اپنے معتمد بھیجے کہ آریوں اور ان کی شدھی تحریک کا سدباب کیا جاسکے اور کاموں کے ساتھ علامہ شبلی اس کام میں بھی مسلسل لگے رہے۔ ۱۹۱۲ء میں ندوہ کے جلسہ میں اسے ایک ملی مسئلہ کی شکل میں پیش کرنے کی غرض سے اخبارات میں اپیل شائع کی، اس میں ارتداد کی تفصیل کے ساتھ اس کے تدارک کی چند تجویزیں پیش کیں، انہوں نے لکھا ہے کہ

”جو تدبیریں اس وقت خیال میں آئیں ہیں وہ اس غرض سے پیش کی جاتی ہیں کہ تمام حضرات کو ان پر غور اور فکر کا موقع ملے، وہ تدبیریں حسب ذیل ہیں۔

۱- اس قسم کے واعظ مقرر کیے جائیں جو دو دو چار چار مہینے ایک گاؤں میں رہ کر لوگوں کو اسلام کے احکام سکھائیں، اس قسم کے واعظوں کے تیار کرنے کا خاص انتظام ہونا چاہیے۔

۲- دو دو چار چار گاؤں کے بیچ میں ابتدائی مدرسے قائم کیے جائیں، جن میں قرآن شریف اور اردو کی تعلیم دی جائے۔

۳- صوفی وضع لوگ بھیجے جائیں، جن کا اثر عوام پر خود بخود پڑتا ہے۔

۴- مسلمانوں کے دیہات میں جو سرکاری ابتدائی مدرسے ہیں، کوشش کی جائے کہ ان کے مدرسین مسلمان مقرر ہوں۔ اب تک اکثر ہندو مدرس مقرر ہوتے ہیں اور اس لیے بچوں کو اسلام کی طرف رغبت نہیں ہو سکتی، غرض یہ ایک نہایت اہم مذہبی اور قومی مسئلہ ہے، اس کو نہایت غور، فکر اور جہد و جہد سے حل کرنا چاہیے، اگر مسلمان ایسے خطرہ کی پرواہ نہیں کرتے تو ان کو اسلام کا نام نہیں لینا چاہیے۔ (مسلم گزٹ، ۱۱ مارچ ۱۹۱۲ء)

اسی فتنہ ارتداد کے سدباب کے لئے انہوں نے اشاعت اسلام کا منصوبہ بنایا

اور بڑے پیمانہ پر تحریک کا آغاز کیا، مولانا سید سلیمان ندوی کو اشاعت اسلام کا مددگار ناظم مقرر کیا، واعظین تیار کرنے کی کوشش کی، اسی سلسلہ میں ندوہ میں سنسکرت کی تعلیم کا نظم کیا، غرض اشاعت اسلام کے ضروری انتظامات میں لگے رہے، مگر ندوہ کے خلفشار اور قلیل مدت حیات نے اسے عملی جامہ پہنانے کا موقع نہیں دیا اور تحریک حفاظت و اشاعت اسلام کا کام آگے نہ بڑھ سکا۔

سانحہ مسجد کان پور

۱۹۱۳ء میں انگریزی حکومت کے کارپردازوں نے مچھلی بازار کان پور کی مسجد کا وضو خانہ منہدم کرا کے میونسپلٹی کی سڑک نکالی، مسلمانوں نے اس کے خلاف جلسہ کیا اور اسے تعمیر کرنے کی کوشش کی تو نہتے مسلمانوں پر پولس نے گولیاں برسائیں جس میں متعدد افراد شہید ہو گئے، شہیدوں میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی شامل تھے۔ اس واقعہ نے تمام ملک میں اک آگ سی لگا دی، جس وقت یہ واقعہ پیش آیا علامہ شبلی اس وقت بمبئی میں تھے، ان کے اضطراب کا یہ عالم تھا کہ

شبلی بمبئی میں رہ کر محروم سعادت ہے

علامہ شبلی اس واقعہ سے تڑپ اٹھے، اسی درد و غم میں انہوں نے کئی قطعات اور نظمیں کہیں، جو الہلال، ہمدرد، زمیندار وغیرہ میں شائع ہوئیں۔ یہ پرجوش نظمیں جب شائع ہوئیں تو بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ گئیں اور عرصہ تک دلوں کو تڑپاتی اور گرماتی رہیں، اس سلسلہ کی سب سے مشہور نظم یہ ہے:

کل مجھ کو چند لاشہ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور تھے
کچھ طفل خور دس سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آگئی ہے منتظر نفع صور ہیں

کچھ نوجوان ہیں بے خبر نشہ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحب عقل و شعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
سینہ پہ ہم نے روک لئے برچیوں کے وار
از بسکہ مست بادہ ناز و غرور ہیں
ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر
لذت شناس ذوق دل ناصبور ہیں
کچھ پیکر نہ سال ہیں دلدادہ فنا
جو خاک و خون میں ہمہ تن غرق نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
ہم کشنگان معرکہ کان پور ہیں
ان نظموں سے علامہ شبلی کی حمیت و غیرت اسلامی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سیرۃ النبیؐ

اس سلسلہ کا علامہ شبلی کا سب سے بڑا کارنامہ سیرۃ النبیؐ کی تالیف و تدوین ہے، انہوں نے سیرت نبوی کے متعلق لکھا ہے کہ:

”سیرت نبوی جو زیر تصنیف ہے، میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے مصنفین نے جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھا ہے اس سے پوری واقفیت حاصل کی جائے تاکہ ان کے تائیدی بیان حسب موقعہ حجت الزامی کے طور پر پیش کیے جائیں اور جہاں انھوں نے غلطیاں اور بددیانتیاں کی ہیں، نہایت زور و قوت کے ساتھ ان کی پردہ دری کی جائے۔“
(مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۱۶۳-۱۶۴)

ان کا یہ بھی خیال تھا کہ:

”سیرت نبویؐ کی اشاعت کی ضرورت سب سے زیادہ یورپ میں ہے تاکہ یورپ کے خیالات کی اصلاح ہو سکے۔“ (مقالات شبلی ج ۸ ص ۳۶)
چنانچہ علامہ شبلی نے سیرۃ النبیؐ میں جہاں جہاں مستشرقین اور مخالفین اسلام کے اعتراضات تھے ان کے جوابات لکھے اور ثابت کیا کہ یہ اعتراضات لغو اور بے سروپا ہیں۔

دارالمصنفین

علامہ شبلی کا آخری کارنامہ دارالمصنفین ہے۔ یہ بھی دراصل ان کے اقدار اسلامی کے تحفظ کا حصہ ہے۔ اس کے مقاصد میں ایسے اہل قلم کی تربیت اور تیاری شامل ہے جو دفاع اسلام کا کام انجام دے سکیں اور اسلام پر ہونے والے حملوں کا جواب دے سکیں، چنانچہ دارالمصنفین نے سو سال کی تاریخ میں یہ کام بڑے پیمانہ پر انجام دیا ہے اسلام اور مستشرقین کے عنوان سے بین الاقوامی سمینار کا انعقاد دراصل اسی سلسلہ کی توسیع تھی۔ اس میں پیش کئے گئے مقالات کو دارالمصنفین نے سات جلدوں میں شائع کیا ہے۔

غرض علامہ شبلی مدۃ العمر اسلام اور اسلامی اقدار و روایات کے تحفظ کے لئے کوشاں رہے اور بڑی جدوجہد کی۔

علامہ شبلی نعمانی کا نظریہ تاریخ

علامہ شبلی مشرق و مغرب دونوں کے تاریخی نظریات سے بخوبی واقف تھے۔ وہ جہاں اسلامی اور ایرانی مورخین کے تاریخی اصول و آئین اور افکار و خیالات پر وسیع نظر رکھتے تھے جن سے انھوں نے مکمل استفادہ کیا تھا، وہاں انھوں نے مغربی مورخین کے عمدہ اصولوں سے بھی اخذ و استفادہ کیا تھا، جس طرح انھوں نے اسلامی مورخوں کے نقائص بیان کئے ہیں، اسی طرح یورپ کے مورخین کی بے اعتدالیوں سے بھی آگاہ کیا ہے۔ اس فن میں ان کی کاملیت و جامعیت اور بصیرت و ژرف نگاہی کی وجہ سے عموماً اعتراف کیا جاتا ہے کہ علامہ شبلی دراصل خود اپنا ایک نظریہ تاریخ رکھتے تھے اور اس بارے میں وہ کسی کے پیرو یا مقلد نہ تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

”شبلی درحقیقت ایک مسلم مورخ تھے۔ اسلامی تاریخ کی تائید و حمایت میں جو خیال انھیں پسند آتا تھا اس کو حسب مطلب استعمال کر لیتے تھے۔ جہاں تک راقم کا خیال ہے وہ کسی خاص مغربی نظریہ اور مسلک کے پابند نہ تھے۔“ (شبلی کا نظریہ تاریخ ماہنامہ اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۳۸ء ص ۲۸۲۔)

وہ دور جدید کے پہلے مورخ ہیں جنھوں نے مشرق و مغرب کے تصورات تاریخ پر حسن و قبح کی نظر ڈالی اور ان نظریات کی آمیزش اور اپنی مجتہدانہ صلاحیتوں سے ایک نئے فلسفہ تاریخ کی بنیاد ڈالی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے درست لکھا ہے کہ:

”وہ صرف مورخ ہی نہ تھے بلکہ ایک خاص فلسفہ تاریخ کے واضع و نقاد بھی تھے۔ انھوں نے مغرب اور مشرق کے تاریخی سرمائے پر جو تنقید کی ہے وہ بلا شائبہ مبالغہ اصول تاریخ کے لئے ایک دستور اساسی کا حکم رکھتی ہے۔“ (سیر سید اور ان کے نامور رفقاء ص ۱۵۲۔)

علامہ شبلی کے فلسفہ تاریخ کے متعلق دور جدید کے دیدہ ورمورخ پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

”فن تاریخ نویسی میں مولانا شبلی کا سب عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے عربی، ایرانی اور مغربی نظریہ ہائے تاریخ کو ایک فکری وحدت میں ڈھال کر اس طرح پیش کیا کہ اس میں عربوں کی حقیقت نگاری، ایرانیوں کا ذوق ادب اور مغرب کا انداز تحقیق جمع ہو گیا۔“ (معارف اعظم گڑھ مارچ ۱۹۸۶ء ص ۱۸۸۔)

ہم یہاں علامہ شبلی کی ان خصوصیات پر ایک نظر ڈالتے ہیں، انھوں نے تاریخ کی تعریف ایک بڑے مصنف اور ایک حکیم کے حوالہ سے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

”فطرت کے واقعات نے انسان کے حالات میں جو تغیرات پیدا کئے ہیں اور انسان نے عالم فطرت پر جو اثر ڈالا ہے ان دونوں کے مجموعہ کا نام تاریخ ہے..... ان حالات کا پتہ چلانا جن سے دریافت ہو کہ موجودہ زمانہ گزشتہ زمانہ سے کیوں کر بطور نتیجہ پیدا ہوا۔“ (الفاروق ص ۹۔)

دوسری جگہ مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”چونکہ یہ مسلم ہے کہ آج دنیا میں جو تمدن، معاشرت، خیالات، مذاہب موجود ہیں سب گزشتہ واقعات کے نتائج ہیں جو خواہ مخواہ ان سے پیدا ہونے چاہئے تھے، اس لئے ان گزشتہ واقعات کا پتہ لگانا اور ان کو اس طرح ترتیب دینا جس سے ظاہر ہو کہ ہر موجودہ واقعہ گزشتہ واقعات سے کیوں کر پیدا ہوا، اسی کا نام تاریخ ہے۔“ (الفاروق ص ۹)

تاریخ کی اس تعریف کے بارے میں پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی لکھتے ہیں:

”حقیقت یہ ہے کہ یہ تعریف بڑی جامع ہے، عالم فطرت میں واقع ہونے والے واقعات اور تبدیلیوں کا اثر انسانوں کی ساخت مزاج اور فکر و عمل پر پڑتا ہے، پھر ان کے فکر و عمل کی جولانیوں کی وجہ سے عالم فطرت کے بہت سے اسرار کھلتے رہے ہیں اور کھلتے رہیں گے۔ آدمی کی کہانی اسی عمل اور رد عمل کی داستان ہے، پھر دنیا میں جو

کچھ ہوتا ہے وہ کسی آنے والے واقعہ کا سبب بن جاتا ہے۔ علت و معلول کا یہ سلسلہ ابتداءً آفرینش سے جاری ہے اور جاری رہے گا۔ آدمی کی کہانی اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔“ (اشخاص و افکار ص ۶۰)

علامہ شبلی کا فلسفہ تاریخ جن اصولوں پر مشتمل ہے ان کی تصریح خود انھوں نے اپنی تحریروں میں جا بجا کی ہے، مثلاً تاریخ کیا ہے؟ تاریخ کا مقصد کیا ہے؟ مورخ کے فرائض کیا ہیں؟ اسے کن کن باتوں کا علم ہونا چاہئے، اسے کن باتوں پر عمل اور کن سے احتراز کرنا چاہئے، مورخ کا انداز تحریر کیسا ہو؟

یہاں علامہ شبلی کے انھیں اصولوں کا تجزیہ کیا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ انھوں نے اسلامی تاریخ اور مغربی تاریخ دونوں کی کن خوبیوں کو کس حد تک استعمال کیا۔ خامیوں کو کن بنیادوں پر نظر انداز کیا۔ گویا مجموعی طور پر ان کے فلسفہ تاریخ کا تصور کیا ہے؟

۱۔ مورخ جس عہد کی تاریخ لکھے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس عہد کے تمام حالات و واقعات لکھے مثلاً تہذیب و تمدن، معاشرت، اخلاق و عادات، مذہب گویا ہر چیز سے متعلق معلومات بہم پہنچائے۔ صرف سیاسی امور، فتح و شکست، معرکوں اور خانہ جنگیوں کا تذکرہ نہ ہو اور سیاست اور تاریخ معاشرت کی داستان طرازی کا فرق اور موخر الذکر کی اہمیت علامہ شبلی کی اس بلیغ تحریر سے ظاہر ہے کہ:

”کسی غیر قوم کا کسی غیر ملک پر قبضہ کرنا کوئی جرم نہیں ورنہ دنیا کے سب سے بڑے فاتح سب سے بڑے مجرم ہوں گے۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ فاتح قوم نے ملک کی تہذیب و تمدن پر کیا اثر ڈالا۔ (مقالات شبلی ج ۶، ص ۱۱۴)

شروع میں مشرق و مغرب کے بیشتر مورخین محض جنگ و جدل اور امور سیاست کے واقعات بیان کرتے رہے، لیکن اس طرز تاریخ نویسی سے بقول علامہ شبلی ”انسانی تہذیب و معاشرت کے بہت سے روایات اور شاندار آثار مٹ گئے۔ خود مسلمانوں کی تاریخ کے بہت سے عجیب و غریب کارنامے گمنامی کی خاک میں دفن ہو گئے۔ (ایضاً ص ۱۷۶) علامہ شبلی خاص طور پر ایشیائی مورخین کے بارے میں لکھتے ہیں:

”ایشیائی مورخین کی عادت ہے کہ وہ تاریخی واقعات میں صرف جنگ و جدل، بغاوت اور خونریزی کے واقعات کو لیتے ہیں اور ان کو خوب پھیلاتے ہیں۔ اس لئے یورپ والے ہماری تاریخوں کو قصائی کی دوکان کہتے ہیں اور واقعی ان تاریخوں سے اس عہد کے تمدن، شائستگی، پالکس، معاشرت، خانگی زندگی کا پتہ لگانا ہو تو بہت کم کامیابی ملے گی۔“ (ایضاً ج ۳ ص ۵۹)

ایرانی تاریخ کے بارے میں لکھتے ہیں:

”ایران کی تاریخ میں دوران کار واقعات کثرت سے ہیں اور فردوسی کی شاعرانہ رنگ آمیزی نے تو تاریخ کو ناول بنا دیا۔“ (مقالات شبلی ج ۴ ص ۲۵)

اٹھارہویں صدی عیسوی سے پہلے جو یورپ کے عہد ظلمت سے نکلنے کا عہد ہے، خود یورپ کا بھی یہی حال تھا۔ ان کے نزدیک بھی کسی سلطنت کی عظمت و سطوت اور پستی و تنزل کا معیار فتوحات ملتی تھیں۔ (ماہنامہ معارف اعظم گڑھ ج ۴۱ ش ۳ ص ۲۰۰)

اسلامی مورخوں نے یہی مروجہ اور عام طرز سیرت نگاری میں بھی اختیار کیا۔ چنانچہ ابتداءً جو کتابیں سیرت پر قلم بند کی گئیں ان کا نام اسی طرز نگارش کی وجہ سے مغازی رکھا گیا اور ان میں صرف عہد رسالت کے معرکوں کا ذکر کیا گیا، حالانکہ یہ طرز نگارش نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح نگاروں کے لئے کسی طرح موزوں نہ تھا، کیوں کہ علامہ شبلی کے الفاظ میں ”یہ سکندر کے سوانح نہیں بلکہ فرشتہ یزدانی کی سیرت تھی۔“ (سیرۃ النبیؐ ج ۱، دیباچہ ص ۴۵) اور طرفہ تماشہ یہ کہ اس طرز تاریخ نگاری کا یہ حال ہے کہ بقول علامہ شبلی ”تاریخوں میں حالات جنگ کے ہزاروں صفحے پڑھ کر بھی فن جنگ کے اصول پر کوئی معتد بہ اطلاع نہیں ملتی۔“ (الفاروق حصہ اول ص ۱۱)

۲۔ مورخ کا یہ فرض ہے کہ وہ تمام واقعات میں سبب اور مسبب کا سلسلہ تلاش کرے، کیوں کہ اس کے بغیر واقعات اپنی اصلی صورت میں سامنے نہ آسکیں گے اور چونکہ ”تاریخ عالم کا ہر واقعہ بہت سے مختلف واقعات کے سلسلے میں بندھا ہوا ہے۔ (المامون ص ۱۱) مثلاً یہ کہ چند صحرا نشینوں نے کیوں کر فارس و روم کا دفتر الٹ دیا اور یہ کہ عباسیہ اور سادات کے ہوتے ہوئے بنو امیہ کیوں کر خلافت پر قابض ہو گئے۔ اس لئے ان اسباب کا پتہ لگانا نہایت ضروری ہے اور ایک

مورخ بغیر ان امور کا سراغ لگائے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ نہیں سکتا۔ علامہ شبلی کے الفاظ میں:

”انھیں ریشہ دوانیوں کا پتہ لگانا اور ان سے فلسفیانہ نکتہ سنجی کے ساتھ تاریخی نتائج

مستنبط کرنا یہی چیز ہے جو علم تاریخ کی جان اور روح ہے۔“ (المأمون ص ۱۱)

باوجود اس اہمیت کے علامہ شبلی کو شکایت ہے کہ ایک جانب اسلامی مورخوں نے اس اصول کی طرف نظر بھی اٹھا کر نہ دیکھا تو دوسری جانب یورپ نے اس سے غلو کی حد تک اعتناء کیا، اس لئے وہ راہ اعتدال سے بھٹک گیا۔ چنانچہ انھوں نے اسباب و علل کی تلاش اور ان سے نتائج مستنبط کرنے میں یورپ کی بے اعتدالیوں سے احتراز کیا ہے۔

۳۔ واقعات میں اسباب و علل کے سلسلے پیدا کرنے کے لئے اکثر جگہ قیاس و اجتہاد سے مورخ کو کام لینا پڑتا ہے اور چونکہ وہ اس سے صرف نظر نہیں کر سکتا اس لئے اس کا یہ لازمی فرض ہے کہ وہ قیاس و اجتہاد کو اصل واقعہ میں اس قدر مخلوط نہ کر دے کہ کوئی شخص اگر دونوں کو الگ کرنا چاہے تو نہ کر سکے۔ (الفاروق ص ۱۸-۱۹)

قیاس و اجتہاد سے جو رائے قائم کی جاتی ہے اسلامی مورخین نے اسے اصل واقعہ میں مختلط ہونے سے بچانے کے لئے اس قدر احتیاط کی کہ گرد و پیش کے ظاہری اسباب و علل پر بھی نظر نہ ڈالی اور واقعات کو خشک اور ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ مثلاً انھوں نے اکثر غزوات کا تذکرہ اس طرح شروع کیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں قبیلہ پر فلاں وقت فوجیں بھیج دیں مگر فوجیں بھیجنے کے اسباب پر مطلق روشنی نہیں ڈالی۔ اسلامی مورخوں کی اس غیر ضروری احتیاط سے بقول علامہ شبلی ”عام ناظرین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ کفار پر حملہ کرنے اور ان کو تباہ و برباد کرنے کے لئے کسی سبب اور وجہ کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ عام وجہ کافی ہے کہ وہ کافر ہیں۔ اسی سے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ حالانکہ زیادہ چھان بین سے ثابت ہوتا ہے کہ جن قبائل پر فوجیں بھیجی گئیں وہ پہلے سے آمادہ جنگ اور مسلمانوں پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے۔ (سیرۃ النبیؐ ج ۱، دیباچہ ص ۳۹)

اسباب و علل کی طرف اسلامی مورخین کے توجہ نہ دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ انھوں نے تاریخ میں واقعت اور صداقت کے پہلو پر اپنی ساری توجہ مبذول کر دی۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

”اسلامی مورخ نہایت سچائی اور انصاف اور خالص بے طرفداری سے واقعات کو ڈھونڈھتا ہے اس کو اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ واقعات کا اثر اس کے مذہب پر، معتقدات پر اور تاریخ پر کیا پڑے گا۔ اس کا قبلہ مقصد صرف واقعیت ہوتی ہے۔ وہ اس پر اپنے معتقدات اور قومیت کو بھی قربان کر دیتا ہے۔“ (ایضاً ص ۳۸-۳۹)

اس کے برعکس مغربی مورخین نے اسباب و علل کی تلاش پر بہت زور دیا، مگر اس میں انھوں نے اپنی خود غرضی اور خاص مٹح نظر کی وجہ سے بڑی بے اعتدالیاں کیں۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ:

”وہ نہایت دور دراز قیاسات اور احتمالات سے سلسلہ معلومات پیدا کرتا ہے اس میں بہت کچھ اس کی خود غرضی اور خاص مٹح نظر کو دخل ہے، وہ اپنے مقصد کو محور بنالیتا ہے۔ تمام واقعات اسی کے گرد گردش کرتے ہیں۔“ (ایضاً)

علامہ شبلی نے یورپ کی اسی بے اعتدالی کو طرز استدلال کی ملمع سازی اور یورپ کا خاص انداز قرار دیا ہے۔ (الفاروق حصہ دوم ص ۴)

غرض اسباب و علل کی تلاش میں قیاس و اجتہاد سے نتائج مستنبط کرنے کے سلسلہ میں علامہ شبلی نے ایک معتدل اصول پیش کیا ہے جیسا کہ اوپر کے تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

۴۔ مورخ جو واقعہ قلم بند کرے اس کی صحت و صداقت مسلم ہونی چاہئے۔ صحت واقعہ کی تعیین کے لئے مغربی مورخین کے یہاں کوئی اصول و ضابطہ نہیں ہے۔ البتہ اسلامی مورخین نے اس پر بہت زور دیا اور اس کے لئے دو اصول روایت و درایت ایجاد کئے۔ علامہ شبلی نے ان دونوں اصولوں کو صحت واقعہ کے لئے نہایت ضروری قرار دیا ہے۔

۵۔ جو واقعہ قلم بند کیا جائے اس شخص سے کیا جائے جو خود شریک واقعہ تھا اور اگر وہ خود شریک واقعہ نہ تھا تو شریک واقعہ تک تمام راویوں کا نام بہ ترتیب بتایا جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کی جائے کہ جو اشخاص سلسلہ روایت میں آئے کون لوگ تھے۔ کیا مشاغل تھے۔ چال چلن کیسا تھا۔ سمجھ کیسی تھی۔ ثقہ تھے یا غیر ثقہ۔ سطحی الذہن یا دقیقہ بین۔ عالم تھے یا جاہل۔ (سیرۃ النبیؐ ج ۱، دیباچہ ص ۲۴-۲۵)

علامہ شبلی نے روایت کو اسلامی فن تاریخ کا پہلا اصول قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:
 ”اس امر پر مسلمان بے شبہ فخر کر سکتے ہیں کہ روایت کے فن کے ساتھ انھوں نے
 جس قدر اعتناء کیا کسی قوم نے کبھی نہیں کیا۔ انھوں نے ہر قسم کی روایتوں میں مسلسل
 سند کی جستجو کی اور راویوں کے حالات اس تفصص اور تلاش سے بہم پہنچائے کہ اس کو ایک
 مستقل فن بنادیا جو فن رجال کے نام سے مشہور ہے۔“ (الفاروق حصہ اول ص ۱۲)

یہ اصول اصلاً مسلمانوں نے فن حدیث کے لئے وضع کیا تھا مگر فن تاریخ میں بھی
 مسلمانوں نے اس سے کام لیا۔ (ایضاً) قدیم مورخین اسلام نے اپنی تصنیفات میں اس کا سختی سے
 التزام کیا۔ البتہ متاخرین نے اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دی جب کہ یورپ کے مورخین اس فن
 کے نام سے بھی واقف نہیں۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

”یورپ نے فن تاریخ کو آج کمال کے درجے پر پہنچا دیا ہے لیکن اس خاص امر
 (روایت) میں وہ مسلمان مورخوں سے بہت پیچھے ہیں، ان کو واقعہ نگار کے ثقہ
 اور غیر ثقہ ہونے کی کچھ پرواہ نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ جرح و تعدیل کے نام سے
 بھی آشنا نہیں۔“ (ایضاً)

چنانچہ یورپ میں جب کوئی واقعہ مدت کے بعد قلم بند کیا جاتا ہے تو چونکہ مورخین
 یورپ جرح و تعدیل اور روایت کے اصولوں سے واقف نہیں اس لئے بقول علامہ شبلی:
 ”ہر قسم کی بازاری افواہیں قلم بند کر لی جاتی ہیں جن کے راویوں کا نام و نشان تک
 معلوم نہیں ہوتا۔ ان افواہوں میں سے وہ واقعات انتخاب کر لئے جاتے ہیں جو
 قرائن اور قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد یہی خرافات ایک
 دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتے ہیں۔ یورپ کی تاریخی تصنیفات اسی اصول پر لکھی
 گئی ہیں۔“ (سیرۃ النبی ج ۱، دیباچہ ص ۲۴)

۶۔ مورخ جو واقعہ لکھے وہ عقلی شہادت کے مطابق ہو یا واقعہ پر اصولِ درایت سے تنقید
 کر کے واقعہ کی صحت کا تعین کرے مثلاً

۱۔ واقعہ اصولِ عادت کی رو سے ممکن ہے یا نہیں؟

۲- واقعہ کے متعلق اس زمانہ میں لوگوں کا میلان عام مخالف تھا یا موافق؟

۳- واقعہ اگر کسی حد تک غیر معمولی ہے تو اسی نسبت سے ثبوت کی شہادت زیادہ قوی

ہے یا نہیں؟

۴- اس امر کی تفتیش کی جائے کہ راوی جس چیز کو واقعہ ظاہر کرتا ہے اس میں اس کے

قیاس اور رائے کا کس قدر حصہ شامل ہے۔

۵- راوی نے واقعہ کو جس صورت میں ظاہر کیا ہے وہ واقعہ کی پوری تصویر ہے یا اس

امر کا احتمال ہے کہ راوی اس کے ہر پہلو پر نظر نہیں ڈال سکا اور واقعہ کی تمام خصوصیتیں نظر میں نہ آسکیں۔

۶- اس بات کا اندازہ لگایا جائے کہ زمانے کے امتداد اور مختلف راویوں کے طریقہ ادا

نے روایت میں کیا کیا اور کس کس قسم کے تغیرات پیدا کر دیئے ہیں۔ (الفاروق ص ۱۴-۱۵)

علامہ شبلی کا خیال ہے کہ ”ان اصولوں کی صحت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا اور ان

کے ذریعہ بہت سے مخفی راز معلوم ہو سکتے ہیں۔“ (ایضاً)

روایت و درایت دونوں اصولوں کی ابتداء قرآن مجید سے ہوئی۔ (سیرۃ النبیؐ ج ۱، ص

۲۶-۲۷) روایت کے ساتھ مسلمان مورخوں نے اس قدر اعتناء کیا کہ اسے ایک قابل فخر فن بنادیا

مگر درایت کو جس قدر ترقی دینی چاہئے تھی وہ اس سے محروم رہا اور فن تاریخ میں تو اس کا نام بھی نہیں

لیا گیا۔ ابن مسکویہ پہلا مورخ ہے جس نے تجارب الامم میں پہلی بار اس موضوع پر روشنی ڈالی،

اس کے بعد ابن خلدون نے درایت کی طرف خاص توجہ دی اور اس کے اصول نہایت باریک بینی

اور نکتہ بینی کے ساتھ مرتب کئے۔ ان کا خیال ہے کہ ”واقعہ کی تحقیق میں پہلے جرح و تعدیل سے

بحث نہیں کرنی چاہئے، بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ واقعہ فی نفسہ ممکن بھی ہے یا نہیں، کیوں کہ اگر واقعہ کا

ہونا ممکن ہی نہیں تو راوی کا عادل یا ثقف ہونا بیکار ہے۔ امکان سے مراد امکان عقلی نہیں بلکہ اصول

عادت اور قواعد تمدن ہیں۔ (الفاروق ص ۱۳)

علامہ شبلی نے درایت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اور وہ ابن مسکویہ اور ابن خلدون سے

ماخوذ ہے۔

درایت کے سلسلہ میں یورپ کے جدید مورخین نے بھی کافی توجہ دی ہے، مگر قدیم مورخین بہر حال اس سے نا آشنا تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

”یہ اس وقت سے رائج ہے جب یورپ کے عیسائی مورخ اپنے بزرگوں کی کرامتوں اور خوارق کے ذکر ہی کو تاریخ نویسی کا کمال سمجھتے تھے، ان کے نزدیک ازمنہ ماضی کی تاریخ بلکہ تاریخ کا سارا سرمایہ یونان سے متعلق تھا جن کا خیال تھا کہ مذہبی معاملات میں عقل سے کام لینا جرم ہے۔“ (معارف اعظم گڑھ ج ۴، ش ۳، ص ۲۰۲-۲۰۳)

۷- واقعات کو مختلف علوم و فنون سے تعلق ہوتا ہے۔ اس لئے مورخ کا ایک ضروری فریضہ یہ بھی ہے کہ واقعہ کا تعلق جن فنون سے ہے وہ اس کا ماہر ہو مثلاً اگر جنگ کے واقعات لکھے تو فن حرب سے واقف ہو، انتظامی امور قلم بند کرے تو قانون سے واقف ہو، اخلاقی تذکرے تحریر کرے تو علم الاخلاق سے آشنا ہو، سیاست پر خامہ فرسائی کرے تو اصول سیاست کا ماہر ہو۔ کیوں کہ بقول علامہ شبلی:

”مورخ اگر ان تمام امور کا ماہر ہو تو واقعات کو علمی حیثیت سے دیکھ سکتا ہے، ورنہ اس کی نظر اسی قسم کی سطحی ہوگی جیسی کہ ایک عامی کی ہو سکتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر کسی عمدہ عمارت پر ایک ایسے واقعہ نگار انشاء پر داز کا گزر ہو جو انجینئری کے فن سے ناواقف ہے تو گو وہ اس عمارت کا بیان ایسے دلکش پیرائے میں کرے گا جس سے عمارت کی رفعت اور وسعت اور ظاہری حسن و خوبی کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے، لیکن اگر اس کے بیان میں خاص انجینئری کے علمی اصول اور اس کی باریکیاں ڈھونڈھی جائیں تو نزل سکیں گی۔“ (الفاروق حصہ اول ص ۱۱)

اس اصول سے علامہ شبلی کے ذہن رسا کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ دراصل ان کے فلسفہ تاریخ کا بنیادی جزء ہے گو یہ اصول تاریخ نویسی کے لئے نہایت سخت اور مشکل ہے تاہم اگر مورخ ان خوبیوں سے آراستہ ہو تو وہ واقعی تاریخ نگاری سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں علامہ شبلی کے اس خیال کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ”اگر خوش

قسمتی سے تاریخ کا فن ان لوگوں کے ہاتھ میں رہا ہوتا جو تاریخ کے ساتھ فن جنگ، اصول قانون، اصول سیاست اور علم الاخلاق سے بھی آشنا ہوتے تو آج یہ فن کہاں سے کہاں پہنچا ہوتا۔ بد قسمتی سے ہمارے مورخین اس معیار کے حامل نہیں تھے۔ اسی وجہ سے بقول علامہ شبلی ”تاریخ کا فن نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ تمام قوموں میں نا تمام رہا۔ (ایضاً ص ۱۰-۱۱)

۸- علامہ شبلی نے رینکی (RENKE) کے بارے میں ایک پروفیسر کے حوالہ سے لکھا

ہے کہ:

”اس نے تاریخ میں شاعری سے کام نہیں لیا، وہ نہ ملک کا ہمدرد بنانا مذہب اور قوم کا طرفدار ہوا، کسی واقعہ کے بیان کرنے میں مطلق پتہ نہیں چلتا کہ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے اور اس کا ذاتی اعتقاد کیا ہے؟“ (الفاروق حصہ اول ص ۱۱)

اس عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی بھی ایک مورخ کے لئے یہ ضروری خیال کرتے تھے کہ وہ تاریخ نگاری میں شاعری اور انشاپردازی سے کام نہ لے، نہ ملک و قوم کی ہمدردی و طرفداری اور اس کی خوشی و ناخوشی اور اعتقاد ذاتی اس کی تاریخ نگاری پر اثر انداز ہوں۔ صاف لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ غیر جانبداری کو ضرور خیال کرتے تھے۔

۹- ماضی کے واقعات کو ماضی کے معیار و مذاق سے دیکھنا اور پرکھنا چاہئے اور موجودہ طرز سلطنت کو پچھلی ایشیائی حکومتوں کے اندازہ کرنے کا پیمانہ نہیں بنانا چاہئے۔ (المامون ص ۲۰۳-۲۰۴)

۱۰- علامہ شبلی کے نزدیک مورخ کا منصب واقعہ نگاری ہے، فیصلہ نویسی نہیں کیوں کہ تاریخ کا انداز مقدمہ دیوانی یا فوج داری کے فیصلے سے بالکل مختلف ہے۔ (سیرۃ النبیؐ ج ۱، ص ۳۳۵) اس لئے مورخ کو اپنے منصب پر باقی رہتے ہوئے فیصلہ نویسی سے احتراز کرنا چاہئے۔

۱۱- علامہ شبلی نے مورخ کا لازمی فرض یہ بھی بتایا ہے کہ وہ سادہ واقعہ نگاری کی حد سے تجاوز نہ کرے۔ انشاپردازانہ تاریخ کو اگرچہ قبول عام حاصل ہوتا ہے، لیکن درحقیقت تاریخ اور انشاء پردازی کی حدیں جدا جدا ہیں۔ ان دونوں میں وہی فرق ہے جو نقشہ اور تصویر میں ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

”ان دونوں میں جو فرق ہے وہ نقشہ اور تصویر کے مشابہ ہے، نقشہ کھینچنے والے کا یہ کام ہوتا ہے کہ کسی حصہ زمین کا نقشہ کھینچے تو نہایت دیدہ ریزی کے ساتھ اس کی ہیئت، شکل، اطراف، اضلاع ایک ایک چیز کا احاطہ کرے، بخلاف اس کے مصور صرف ان خصوصیات کو لے گا یا ان کو زیادہ نمایاں صورت میں دکھائے گا جن میں کوئی خاص عجوبگی ہو اور جن سے انسان کی قوت منفعلہ پر اثر پڑتا ہے، مثلاً رستم و سہراب کی داستان کو ایک مورخ لکھے گا تو سادہ طور پر واقعہ کے تمام جزئیات بیان کر دے گا لیکن ایک انشا پرداز ان جزئیات کو اس طرح ادا کرے گا کہ سہراب کی مظلومی و یکسوی اور رستم کی ندامت و حسرت کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے گی اور واقعہ کے دیگر جزئیات باوجود سامنے ہونے کے نظر نہ آئیں گے۔“ (الفاروق حصہ اول ص ۱۸)

علامہ شبلی کے اس اصول تاریخ کا ذکر بھی عموماً مورخین کے یہاں اصول کی حیثیت سے نہیں ملتا۔ اسلامی مورخین نے اس کی طرف ضرور یک گونہ توجہ دی ہے اور مغربی مورخین مثلاً شریمن کینٹ اور رینکی وغیرہ کے یہاں بھی اس اصول کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے، لیکن حقیقتاً اصول کی حیثیت علامہ شبلی نے دی اور اسے مورخ کا لازمی فرض قرار دیا۔

۱۲- علامہ شبلی نے افراد کی تاریخ نگاری میں انسانی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریوں کی نشاندہی کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ (مقالات شبلی ج ۳، ص ۸۱)

۱۳- علامہ شبلی کے نزدیک سیرت و سوانح اگرچہ تاریخ کا حصہ ہے تاہم اسے علوم و فنون کی صف میں ایک خاص درجہ حاصل ہے، ان کا خیال ہے کہ سیرت کے صحیح اور یقینی واقعات حدیث کی کتابوں میں ہیں اس لئے انھوں نے یہ اصول پیش کیا کہ ”سب سے پہلے واقعہ کی تلاش قرآن مجید میں پھر احادیث صحیحہ میں پھر عام احادیث میں کرنی چاہئے۔ اگر نہ ملے تو روایات سیرت کی طرف توجہ کی جائے۔ کتب سیرت محتاج تنقیح ہیں اور ان کے روایات و اسناد کی تنقید لازم ہے۔“ (سیرۃ النبیؐ ج ۱، دیباچہ ص ۵۴)

۱۴- علامہ شبلی نے مورخ کا ایک یہ فرض بھی بتایا ہے کہ وہ اپنی تاریخ میں جن کتب

ومضامین سے استفادہ کرے یا ان میں ظاہر کی گئی آراء و خیالات نقل کرے تو صداقت کو قائم رکھنے کے لئے ان کا حوالہ دے، ان کے نزدیک ”تاریخ اور روایت میں حوالہ اور استناد سب سے مقدم چیز ہے۔“ (ایضاً ص ۶۶)

حوالہ انھیں کتابوں کا دینا چاہئے جنھیں خود مصنف نے دیکھا اور پڑھا ہو، ان کتابوں کا حوالہ نہ دے جسے خود مصنف نے نہ دیکھا ہو، کیوں کہ نقل و نقل ہو کر اکثر واقعات اپنی اصلی صورت پر باقی نہیں رہتے۔ (سیرۃ النعمان دیباچہ ص ۱۴-۱۵) مطبوعہ کتابوں کے مطبع کا بھی اندراج ہو، اگر کتاب قلمی ہے تو اس کی تمام تفصیلات دی جائیں۔

علامہ شبلی کا یہ اصول مغرب سے اخذ کردہ معلوم ہوتا ہے کیوں کہ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ ”اس زمانہ میں انگلستان کے مورخین کا ایک گروہ آکسفورڈ گروپ کے نام سے مشہور تھا، جس نے سند اور حوالہ کو تاریخی دیانت کے لئے مورخ کا لازمی فرض قرار دیا تھا۔“ بہر حال علامہ شبلی کو اردو زبان میں سند اور حوالہ کے التزام میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔

اوپر کی بحث سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تاریخ میں علامہ شبلی کا سب سے عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تاریخ نگاری کے بلند اور معیاری اصول وضع کئے اور نہ صرف علامہ ابن خلدون کی طرح اس کے اصول و آئین منضبط کئے بلکہ انھیں عملی طور پر بھی پیش کرنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم، المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق، اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر اور سیرۃ النبی جیسی بلند پایہ اور مہتمم بالشان کتابیں اور متعدد معرکہ الآراء تاریخی مقالات ہمارے اس دعویٰ کے شاہد عدل ہیں۔

علامہ شبلی کے تعلیمی افکار کی تشکیل میں کارفرما عناصر

علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کی جامع کمال شخصیت جن اوصاف و کمالات سے عبارت ہے اس میں تعلیم کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہ تعلیم و تربیت سے ۲۳ برس تک وابستہ رہے۔ ۱۶ برس [۱۸۸۳-۱۸۹۸ء] تک علی گڑھ کالج سے اور تقریباً ۸ برس [۱۹۰۵-۱۹۱۲ء] تک دارالعلوم ندوہ کے معتمد تعلیم رہے۔ اس طویل مدت میں انہوں نے درس و تدریس کے ساتھ تعلیم و تربیت کی عملی کوششیں کیں۔ نیز نظریہ تعلیم اور نصاب تعلیم کے مختلف گوشوں پر علمی بحث و تحقیق کا فریضہ انجام دیا۔ گویا انہوں نے علمی اور عملی دونوں طریقوں سے تعلیم کے لئے جدوجہد کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تعلیمی افکار و نظریات ایک صدی گزر جانے کے باوجود لائق بحث و نظر اور قابل عمل ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تعلیمی غور و فکر میں ان کے نقطہ نظر سے آج بھی اغماض نہیں برتا جاسکتا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

”ہم نے بار بار کہا ہے اور اب پھر کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے لئے نہ صرف انگریزی مدرسوں کی تعلیم کافی ہے نہ قدیم عربی مدرسوں کی، ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب میں ہے جس کا ایک جز مشرقی اور دوسرا مغربی ہے۔“ (مقالات شبلی جلد ۳ ص ۱۶۳)

عہد شبلی کے ہندوستان میں مسلمانوں کے دو بہت واضح دھڑے تھے۔ ایک دیوبند دوسرے علی گڑھ تحریک۔ دیوبند قدیم اور قدامت کا حامل تھا جبکہ علی گڑھ تحریک جدید تعلیم اور جدید خیالات کی علمبردار تھی۔ ان دونوں تحریکوں کے زیر اثر علماء اور جدید تعلیم یافتہ اشخاص کے درمیان

نظریاتی دوریاں پیدا ہو گئی تھیں۔ علامہ شبلی کا نظریہ تعلیم دونوں کے درمیان مفاہمت کا نظریہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس بعد کو ختم کئے بغیر اصل ترقی ناممکن ہے۔ انہوں نے مدارس قسطنطنیہ کے معائنہ کے بعد سرسید کو لکھا کہ:

”افسوس ہے کہ عربی تعلیم کا پیکانہ یہاں بہت ہی چھوٹا ہے اور جو قدیم طریقہ تعلیم تھا اس میں یورپ کا ذرا بھی پرتو نہیں۔ جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہے لیکن دونوں کے حدود جدا رکھے گئے ہیں اور جب تک یہ دونوں ڈانڈے نہ ملیں گے اصلی ترقی نہ ہو سکے گی، یہی کمی تو ہمارے ملک میں ہے جس کا رونا ہے۔“ (مکاتیب شبلی ج ۱، ص ۱۶)

بعد میں جب وہ تحریک ندوہ سے وابستہ ہوئے تو اس سے اصل وابستگی کا سبب ان کا یہی نظریہ تعلیم تھا۔ اہل علم واقف ہیں کہ تحریک ندوہ کا وجود ہی قدیم صالح اور جدید نافع کے نقطہ نظر سے عبارت تھا۔ اس تحریک سے وابستگی کے زمانہ میں انہوں نے اپنے تعلیمی نقطہ نظر کی بار بار وضاحت کی۔ اس کی اہمیت اور افادیت بتلائی اور تعلیم کے موضوع متعدد گراں قدر مضامین لکھے۔ ان کا پہلا علمی و تعلیمی کارنامہ بھی رسالہ ”مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم“ ہے۔ مولانا شبلی کے سلسلے میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ وہ علی گڑھ کالج کے پہلے ایسے پروفیسر تھے جنہوں نے محض علمی و تعلیمی جائزہ کے لئے روم و مصر و شام کا سفر کیا اور خاص طور پر ان ممالک کے نظام تعلیم و تربیت کا جائزہ لیا، اس کی ایک ایک تفصیل انہوں نے اپنے سفر نامے میں قلم بند کی ہے۔

نصاب تعلیم تیار کرنے کا بھی انہیں خاصا تجربہ تھا۔ سرسید کی فرمائش پر لکھی جانے والی کتاب تاریخ بدء الاسلام در اصل نصابی کتاب تھی۔ اسی طرح الہ آباد یونیورسٹی کے فارسی امتحانات کے لئے انٹرنس سے بی اے تک کا نصاب تیار کیا تھا۔ حیدرآباد کی مشرقی یونیورسٹی کا خاکہ بھی وہ تیار کر چکے تھے۔ ان کے ان تعلیمی کارناموں سے ان کے گہرے تعلیمی شعور کے ساتھ ان کے تعلیمی افکار کی بھی تفصیلات سامنے آتی ہیں جن کا مطالعہ و تجزیہ اگرچہ راقم کا موضوع نہیں تاہم ان سے یہ ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ شبلی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں جس نتیجے پر پہنچے تھے اس کی چند در چند وجوہات تھیں۔ مثلاً ان کی تمام تر تعلیم و تربیت قدیم طرز تعلیم کے مطابق ہوئی تھی اور انہوں

نے قدیم علوم اور طریقہ کار کے حامل ارباب کمال سے تحصیل علم کیا تھا۔ اس کی اہمیت و افادیت بھی ان پر پورے طور واضح تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ جدید تعلیم و تربیت کے سب سے بڑے مرکز علی گڑھ سے وابستہ ہوئے۔ سرسید اور پروفیسر آرنلڈ کی صحبتوں میں جدید آراء و خیالات اور جدید اقتضاءات سے واقف ہوئے تو نہ مولویت کا لبادہ اتارا اور نہ ان سے کسی طرح مرعوب ہوئے بلکہ لکھا کہ:

”معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ مہمل فرقہ ہے، مذہب کو جانے دو خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں۔ یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا، خالی کوٹ پتلون کی نمائش گاہ ہے۔ ہمارے شہر کے نو خیز لڑکے مجھ کو بی اے کی نسبت یہ خیال دلاتے تھے کہ وہ مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کر دیں گے۔ لاجول ولاقوۃ، وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی سمجھ نہیں سکتے۔“ (مکاتیب شبلی ج ۱، ص ۵۹)

غالباً یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ کالج میں انہوں نے مذہبی روح پیدا کرنے کی کوشش کی، درس قرآن کا اہتمام کیا، سیرت نبویؐ کی مجالس کا آغاز کیا جس میں وہ خود سیرت نبویؐ پر تقریریں کرتے۔ غرض یہاں انہوں نے اس طرح زندگی گذاری کی ایک عالم کی شان پر حرف آنے نہیں دیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:

”وہ اپنے فضل و کمال کی بنا پر بجائے اس کے کہ نئے علوم و فنون کے اہل کمال سے مرعوب اور اپنے علوم ان کی نگاہوں میں بے قدر ہوتے، انہوں نے نہ صرف اپنی بلکہ علمائے اسلام کی قدر و منزلت کو بڑھا دیا اور اپنے قدیم علوم و فنون کے مرتبہ کو اتنا اونچا کیا کہ پروفیسر آرنلڈ اور دوسرے انگریز پروفیسروں کو تحسین بلکہ تحویل پر مجبور کر دیا اور ایسے زمانہ میں جب کہ کالج میں ہر طرف نئے علوم، نئے مسائل اور نئی تحقیقات کی بارش ہو رہی تھی، ایک مولانا ہی کا وجود تھا جو اس مسلسل بارش کے طوفان میں اسلامی علم و فن کے منارہ کو اس مضبوطی سے اپنی جگہ پر جمائے ہوئے تھا کہ ان کو اس طوفان خیز

سیلاب سے کوئی خطرہ نہ رہا۔“ (حیات شبلی ص ۱۴۲-۱۴۳)

لیکن اس کا یہ مفہوم بھی نہیں کہ وہ جدید تعلیم کے حامی نہ تھے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ جدید تعلیم کے ایک بڑے ہم نوا اور بڑے علمبردار تھے۔ البتہ ان کا خیال ہے کہ:

”میں اگرچہ نئی تعلیم کو پسند کرتا ہوں اور دل سے پسند کرتا ہوں تاہم پرانی تعلیم کا سخت حامی ہوں اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی قومیت یا مذہبیت قائم رکھنے کے لئے پرانی تعلیم ضروری اور سخت ضروری ہے۔“

(سفر نامہ ص ۵۲)

علامہ شبلی اگرچہ قدیم تعلیم کے سخت حامی تھے اور اس کے لئے انہوں نے بڑی جدوجہد کی مگر وہ اس کی کمیوں اور نقائص سے بھی بخوبی واقف تھے اور اسے کسی قیمت پر قبول کرنے کے لئے راضی نہ تھے۔ علماء کے جمود و قنوط، زمانہ کے تقاضوں سے بے خبری اور جدید اقتضاءات سے ان کی عدم واقفیت کے سبب وہ ان کی اصلاح کے خواہاں تھے اور ان کے لئے جدید علوم و فنون سے واقفیت ضروری خیال کرتے تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

”علماء کو اس بات کا خوف مطلق نہیں کرنا چاہئے کہ علوم جدیدہ مذہب کے برخلاف ہیں اور ان کی تعلیم سے عقائد مذہبی میں خلل آجاتا ہے کیونکہ جب امام غزالی کی طرح وہ ان علوم کو خود حاصل کریں گے تو ان کو وہ مسائل معلوم ہو جائیں گے جن میں مذہبی مخالفت کا احتمال پیدا ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں وہ ان مسائل کی تردید یا اسلام سے ان کی مطابقت بخوبی کر سکیں گے اور جدید تعلیم یا فتوں کو مذہبی شکوک و شبہات سے محفوظ رکھ سکیں گے۔ صاف ظاہر ہے کہ جب تک ہماری قوم کے علماء جدید فلسفہ اور جدید علوم کو بذات خود حاصل نہ کریں گے ناممکن ہے کہ وہ ان اعتراضات کا جواب دے سکیں جو یورپ کے ملاحدہ مذہب اسلام پر کرتے ہیں اور جن کا اثر ہماری قوم کے جدید تعلیم یافتوں پر پڑتا ہے۔“ (خطبات شبلی ص ۸۶-۸۷)

علامہ شبلی ۱۹۰۵ء میں ندوہ کے معتمد تعلیم منتخب ہوئے اور ندوہ میں مستقل قیام کیا تاکہ

جدید نصاب تعلیم تیار کر کے جاری کیا جاسکے۔ اس لئے کہ وہ اپنے مطالعہ و مشاہدہ اور تجربہ و تجزیہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہمارے تنزل کا اصلی سبب ہمارا قدیم نصاب تعلیم ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

”یہ ایک نہایت اہم سوال ہے کہ ہندوستان میں ہمارے علمی تنزل کا اصلی سبب کیا ہے، اس کے مختلف جواب دئے جاسکتے ہیں۔

عام جواب تو یہ ہے کہ تقدیر، لیکن یہ جواب صرف اسی سوال کا جواب نہیں بلکہ دنیا کے تمام سوالوں کا جواب ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ انقلاب سلطنت لیکن اسلامی سلطنتوں کی نسبت کیا کہا جائے گا؟ خاص قنطنیہ میں کم سے کم بیس ہزار طلبہ علوم عربیہ کی تعلیم پاتے ہیں لیکن مدتوں سے ایک شخص بھی صاحب کمال نہیں پیدا ہوا اور سچ یہ ہے کہ مصر و شام و روم کا علمی معیار ہندوستان سے بھی گھٹا ہوا ہے اس سوال کا صحیح جواب صرف یہ ہے کہ ”نصاب تعلیم ناقص ہے۔“ (مقالات شبلی ج ۳ ص ۱۳۱)

وہ معترضین کے خیالات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

”اس جواب پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسی نصاب نے عبدالعلی بجز العلوم، حمد اللہ، محبت اللہ بہاری، قاضی مبارک، شاہ ولی اللہ، ملا حسن جیسے اشخاص پیدا کئے تھے اس لئے اگر نصاب تعلیم کا قصور ہوتا تو اس سے اس درجہ کے کامل الفن کیوں کر پیدا ہوتے۔

اس اعتراض کا سرسری جواب تو یہ ہے کہ جو نصاب اب ہے وہ ان بزرگوں کے زمانہ میں کہاں تھا۔ شرح سلم حمد اللہ، شرح سلم ملا حسن، حاشیہ بحر العلوم، قاضی غلام تکی، ہدیہ سعید یہ وغیرہ کتابیں اس زمانہ میں کہاں تھیں لیکن اس اعتراض کا حقیقی جواب یہ ہے کہ کسی چیز کی خرابی کا اثر عموماً ابتداء میں ظاہر نہیں ہوتا بلکہ یہ اثر پہلے پیدا ہو جاتا ہے پھر آہستہ آہستہ بڑھتا ہے، یہاں تک کہ بالآخر علانیہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ موجودہ نصاب کی خرابی کا اثر پہلے ہی دن سے

شروع ہو گیا تھا جس کی بدیہی دلیل یہ ہے کہ جس دن سے یہ نصاب جاری ہوا
عین اسی وقت سے علمی تنزل شروع ہو گیا، جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے یعنی
جس درجہ کے علماء اس وقت تھے ان کے شاگردان سے کم درجہ کے نکلے، شاگرد
کے شاگردان سے بھی کم، پھر ان سے بھی کم، یہاں تک یہ زمانہ آ گیا جس میں
کمال کا نام و نشان بھی نہ رہا۔“ (مقالات شبلی ج ۳ ص ۱۳۱-۱۳۲)

علامہ شبلی کا خیال ہے کہ

”پہلے طبقوں کا تنزل ہم کو اس لئے محسوس نہیں ہوتا کہ وہ لوگ علم و
فضل میں اگلوں سے کم تھے تاہم آج کی حالت کے لحاظ سے نہایت بلند رتبہ
تھے لیکن جب تنزل کی رفتار تیز تر ہوتی گئی اور اب یہ نوبت پہنچی کہ تمام
ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک ایک بھی صاحب فن نظر نہیں
آتا تو کون شبہ کر سکتا ہے کہ یہ نتیجہ اسی ختم کا ثمر ہے جو سو برس پہلے بویا گیا
تھا۔“ (مقالات شبلی ج ۳ ص ۱۳۲)

علامہ شبلی نے قدیم نصاب تعلیم کی ان بنیادی کمیوں کی نشاندہی کی ہے جس سے ان
کے نظریہ تعلیم کے ان بنیادی عناصر کی بھی وضاحت ہوتی ہے جس کے نتیجے میں یہ کمیاں
وجود میں آئیں۔ مثلاً ان کا خیال ہے کہ ”تعلیم سے مقصود نفس فن ہے جب کہ موجودہ نصاب میں
نفس مسائل کے علاوہ نہایت کثرت سے لفظی مباحث ہوتے ہیں جن کا مدار کسی کتاب کے خاص
الفاظ پر ہوتا ہے۔“ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ ”نصاب موجودہ کی اکثر کتابوں کی یہی حالت ہے یعنی
جس قدر اصل فن کے مسائل ہیں ان کے قریب بلکہ ان سے زیادہ فضول لفظی مسائل ہیں۔“

(مقالات شبلی ج ۳ ص ۱۳۲-۱۳۳)

علامہ شبلی کے نزدیک قدیم نصاب تعلیم کی ”سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں اکثر
ایسی کتابیں داخل ہیں جن میں متعدد فن مخلوط ہیں، اس خلط و محش کی وجہ سے طالب علم کا ذہن
پریشان ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کون سا فن حاصل کر رہا ہے۔“
(ایضاً ص ۱۳۳) قدیم نصاب تعلیم میں علامہ شبلی کے نزدیک ”بہت بڑی غلطی یہ ہے کہ جو علوم

مقصود بالعرض ہیں ان کو مقصود بالذات بنا لیا گیا ہے اور زمانہ تحصیل کا بڑا حصہ انہیں کے حاصل کرنے میں صرف کر دیا جاتا ہے۔“ (ایضاً)

علامہ شبلی نے تدریس اور طریقہ تعلیم پر بحث کرتے ہوئے شروح اور حواشی سے پیدا ہونے والے نقائص کی بھی نشاندہی کی ہے اور لکھا ہے کہ:

”اس موقع پر یہ بتادینا ضروری ہے کہ قدماء کے زمانہ میں شرح اور حاشیہ کا طریقہ نہ تھا۔ بوعلی سینا کے بعد سے یہ طریقہ پیدا ہوا لیکن اس وقت تک شرح میں بھی مصنف کسی خاص عبارت اور الفاظ سے بحث نہیں کرتے تھے بلکہ اصل مسئلہ کی توضیح و تشریح کرتے تھے، اس کے بعد یہ طریقہ پیدا ہوا کہ اصل فن سے چنداں غرض نہیں رہی بلکہ تمام تر توجہ اس پر صرف ہوتی تھی کہ مصنف کی عبارت کا کیا مطلب ہے۔ کس لفظ سے کیا فائدہ ہے۔ کون سی ضمیر کس طرف پھرتی ہے..... وغیرہ وغیرہ۔“ (مقالات شبلی ج ۳ ص ۱۳۳-۱۳۴)

علامہ شبلی نے ندوہ کے لئے جدید نصاب تعلیم تیار کیا جو مذکورہ خامیوں سے پاک تھا تاہم اس سلسلے میں انہیں مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا جو دراصل قدامت پرستی کا اور زمانہ کے اقتضات سے عدم واقفیت کا نتیجہ تھا۔ علامہ شبلی نے ایک مضمون میں معترضین سے چند سوالات کئے ہیں جن سے ان کے نظریہ تعلیم کی تشکیل میں کافر معاصر کی وضاحت ہوتی ہے۔ یہ سوالات آج بھی عہد حاضر کے ذمہ داران مدارس سے کئے جاسکتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

”۱۔ یورپ کے مصنفین مذہب پر جو حملہ کر رہے ہیں ان سے واقف ہونے کی ضرورت ہے یا نہیں؟

۲۔ اگر علماء خود ان خیالات سے واقف نہ ہوں گے تو کیا انگریزی خواں مسلمانوں میں ان خیالات کا شائع ہونا کوئی روک سکتا ہے؟

۳۔ مذہب پر عموماً اور مذہب اسلام پر جو اعتراضات یورپ کے لوگ کر رہے ہیں ان کا جواب دینا کس کا فرض ہے؟

۴۔ علماء جب تک ان خیالات سے واقف نہ ہوں جواب کیوں کر دے سکیں گے؟

۵۔ کیا علمائے سلف نے یونانیوں کا فلسفہ نہیں سیکھا تھا اور ان کے اعتراضات کے جوابات نہیں دئے تھے؟

۶۔ اگر اس وقت اس زمانے کے فلسفہ کا سیکھنا جائز تھا تو اب کیوں جائز نہیں؟ (مقالات شبلی ج ۳ ص ۱۴۵)
یہ سوالات قائم کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں:

ان سوالات کا اگرچہ خود بخود یہ جواب ہوگا کہ تعلیم قدیم کے ساتھ جدید خیالات سے واقف ہونے اور انگریزی زبان اور انگریزی علوم پڑھنے کی ضرورت ہے۔“ (مقالات شبلی ج ۳ ص ۱۴۵)

مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں لکھا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ علامہ شبلی سے عرض کیا کہ ”عربی کے ہر طالب علم کو انگریزی پڑھنے پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے مثلاً جو لوگ فقیہ بننا چاہتے ہیں ان کو انگریزی کیا کام آئے گی؟“ تو علامہ شبلی نے فرمایا کہ:

”عجیب بات کہتے ہو اگر فقہا انگریزی جانتے اور ہماری فقہ کو انگریزی میں منتقل کرتے تو ہدایہ وغیرہ کے انگریزوں اور غیر مسلموں کے لئے ہوئے غلط سلط ترجمے آج عدالتوں میں سند نہ قرار پاتے۔“

(حیات شبلی ص ۱۳۳-۱۳۴)

علامہ شبلی نے ندوہ میں انگریزی تعلیم کے ساتھ اختیاری مضامین کی حیثیت سے ہندی اور سنسکرت کی تعلیم کا بھی نظم کیا تھا اور ایسا انہوں نے آریوں کی شدھی تحریک کے پس منظر میں کیا تھا، ان کا خیال تھا کہ آریوں کے مقابلے کے لئے ان کے علوم کی تحصیل ضروری ہے۔ غرض علامہ شبلی نعمانی کے تعلیمی نظریات کی تشکیل میں جو بنیادی عناصر کا فرما تھے وہ ان کے عہد کے حالات، جدید ملی ضروریات اور جدید تعلیمی تقاضے تھے جن کے شدید احساس سے علامہ شبلی اس نظریہ پر پہونچے تھے کہ جدید تعلیم یافتوں کو مذہبی تعلیم اور علماء کو جدید علوم سے آراستہ ہونا ضروری ہے۔

علامہ شبلی کی ملی درد مندی

(اردو شاعری کے حوالے سے)

علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمہ اردو و فارسی کے قادر الکلام اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کی علمی زندگی کا آغاز بھی شعر و شاعری سے ہوا اور آخر تک شعر کہتے رہے۔ باوجود اس کے ان کا کلیات بہت مختصر (۱۱۶ صفحات) ہے۔ دراصل انہوں نے شعر گوئی کو بطور پیشہ اختیار نہیں کیا بلکہ جب وہ جذبات سے مغلوب ہوتے یا ملت کسی ابتلا و آزمائش کا شکار ہوتی یا اس پر مظالم ڈھائے جاتے یا چین اسلام کے پھولوں کو کسی گستاخ ہاتھوں نقصان پہنچتا تو بے اختیار ان کے غم، ان کے آنسو اور ان کے جذبات شعری پیکر میں ڈھل جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ شبلی کے عنقوان شباب سے پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء تک کے ہندوستان اور عالم اسلام کے اہم واقعات و حوادث کا ذکر ان کے کلام میں موجود ہے۔ ان کی مثنویاں، قصیدے، قومی مسدس بے حد مقبول ہوئے اور ایک عرصہ تک محفلوں کو گرم اور روح کو تڑپاتے اور بیدار کرتے رہے۔ ان کی مذہبی، اخلاقی اور سیاسی نظموں نے ملک میں ایک ہلچل پیدا کر دی تھی۔ جنگ طرابلس، حادثہ مسجد کان پور، مسلم لیگ اور جنگ عظیم سے متعلق ان کی نظموں سے کون ہوگا جوڑ پا اور رویا نہ ہوگا۔ بحیثیت مجموعی چند قصائد و مرثیٰ اور بعض نظموں کو چھوڑ کر ان کا کلام اسلامی حمیت و غیرت کے عناصر سے لبریز ہے۔

علامہ شبلی کا دور نظموں کا دور تھا۔ انہوں نے بھی اسی میدان میں طبع آزمائی کی تاہم شعوری طور پر اپنی ایک راہ الگ نکالی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:

”مولانا (شبلی) نے تاریخی اور اخلاقی نظموں کے دو الگ سلسلے

شروع کئے، جن میں سے ہر ایک اپنی خوبی اور بلندی کے لحاظ سے اردو کے

بڑے بڑے ضخیم دیوانوں کے مقابلہ میں بھاری ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اردو ادب میں ان کی کوئی مثال نہیں اور نہ اب تک ان کی تقلید کی جاسکی۔ ان نظموں نے ایک طرف اسلامی تاریخ کے انمول موتیوں کو ایک دھاگے میں پرو کر قومی اخلاق کے حسن کو دوبالا کیا۔ دوسری طرف ہماری زبان کی شاعری میں صحیح واقعات کو نظم کرنے کے بہترین نمونے پیش کئے۔ اکثر کہا گیا ہے کہ بہترین شاعری وہ ہے جس میں جھوٹ یعنی مبالغہ اور خیال آرائی کا حصہ زیادہ ہو مگر مولانا کی ان نظموں نے یہ دکھا دیا کہ واقعیت کی سطح پر بھی شاعری کا کمال دکھایا جاسکتا ہے۔‘ (کلیات شبلی ص ۱۷)

ان کی نظموں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں تاریخ کی سچائیاں بیان کی گئی ہیں اور بیان واقعہ میں کہیں تخیل اور مبالغے سے کام بھی نہیں لیا گیا ہے، بلکہ ایک حقیقت نگار مورخ کی طرح پورے واقعہ کو نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ واقعیت کے ساتھ شعریت، طرز ادا کی چستی، اثر انگیزی اور استعارات کی نازک خیالی بھی موجود ہے۔ سلاست و روانی بھی کہیں متاثر نہیں ہوتی۔ ہجرت نبویؐ، اہل بیت رسولؑ کی زندگی، ایشاک کی اعلیٰ ترین نظیر، مساوات اسلام، عدل فاروقی کا نمونہ، جرأت و صداقت، ہمارا طرز حکومت، عدل جہانگیری، خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؓ کا انصاف وغیرہ بلند پایہ مذہبی، اخلاقی اور تاریخی نظمیں شبلی کی شاعرانہ عظمت اور رچے ہوئے تاریخی شعور کی مثالیں ہیں۔ انھیں نظموں کو دیکھ کر ڈپٹی نذیر احمد نے کہا تھا:

تم اپنی نثر کو لو نظم کو چھوڑو نذیر احمد

کہ اس کے واسطے موزوں ہیں حالی اور نعمانی

یہ نظمیں اسلامی تاریخ کے بعض واقعات و روایات پر مبنی ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین اور اکابرین کے مرفعے اور تاریخ اسلام کے اخلاقی واقعات کو نظم کا موضوع بنا کر شبلی نے اخلاق سلف کو زندہ کرنے کی کوشش کی ہے اور واضح کیا ہے کہ انسانی جذبات و احساسات کو صحیح سمت، انہیں نصیحت آمیز واقعات سے دی جاسکتی ہے۔ علامہ شبلی کی آخری نظم اہل

بیت رسولؐ کی زندگی اس کی بہترین مثال ہے۔

علامہ شبلی کی نظموں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ملک میں قومی یک جہتی اور رواداری کے جذبات کو فروغ دینے میں معاون ہیں۔ عدل جہانگیری اس سلسلہ کی ایک مثالی نظم ہے۔ البتہ شبلی کی نظم نگاری کے جوہران کی سیاسی نظموں میں زیادہ واضح ہیں۔ یہ منظومات نہ صرف ان کا بلکہ شعر و ادب اور تاریخ و سیاست کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔ عالم اسلام کے سیاسی حالات، مسلمانوں کی پسپائی و زبوں حالی اور ذلت و کبت پر شبلی جس طرح تڑپے اور بے قرار ہوئے ہیں شعراء کے یہاں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اصلاً ان کے یہی خونیں آنسو نظم کے پیکر میں ڈھلے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ تاثیر اور اثر انگیزی کے لحاظ سے ان نظموں کا اردو ادب میں جواب نہیں۔ اس سلسلہ کی نظموں میں سب سے اہم اور قابل ذکر وہ نظم ہے جو انھوں نے جنگ طرابلس کے زمانہ میں شہر آشوب اسلام کے نام سے لکھی تھی اور جو رفاہ عام لکھنؤ کے اجلاس عام میں پڑھی گئی تھی۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشان کبتک چراغ کشتہ محفل سے اٹھے گا دھواں کبتک
قبائے سلطنت کے گرفتار نے کر دیئے ٹکڑے فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کبتک
مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریض خستہ جاں کبتک
یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کبتک
جب یہ نظم پڑھی گئی تو اس کا یہ اثر تھا کہ جلسے میں ہر طرف ماتم برپا ہو گیا۔ (کلیات شبلی ص ۱۴۔ طبع ۲۰۰۷ء) بلاشبہ اس وقت کے عالم اسلام کے جو حالات تھے اس نے مسلمانوں کو سراپا جوش و عمل بنادیا تھا۔ ایک طرف اٹلی نے ترکی پر حملہ کر کے اس سے طرابلس چھین لیا تھا تو دوسری طرف بلقان بھی ترکی پر حملہ آور تھا، جس سے ترکوں کو شدید نقصان پہنچ رہا تھا۔ اس سے مسلمانوں میں سخت ہيجان برپا تھا اور ان کے جذبات مشتعل اور براہیختہ ہو گئے تھے۔ اس پر آشوب زمانے میں شبلی کے علاوہ شاید ہی کسی شاعر نے عالم اسلام کی صورت حال اس پرسوز اور درد انگیز لہجے میں بیان کی ہو۔ عالم اسلام پر جو کچھ گزر رہی تھی وہ تمام کارروائیاں انگریزوں کی طرف سے یا پھر ان کی شہ پر ہو رہی تھیں جو خود کو انسانیت نواز اور امن کا علمبردار بتاتے تھے۔ شبلی کہتے ہیں:

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو یہ ظلم آرائیاں تاکے یہ حشر انگیزیاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک
یہ مانا گرمی محفل کے سماں چاہئے تم کو دکھائیں ہم تمہیں ہنگامہ آہ و فغاں کب تک
یہ مانا قصہ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے سنائیں تم کو اپنے درد دل کی داستاں کب تک
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتاں کب تک
علامہ شبلی کا خیال تھا کہ دولت عثمانیہ کا زوال دراصل شرع ملت کا زوال ہے اور پھر اگر
یہ خلافت محفوظ نہ رہی تو توحید و گلبانگ اذیاں، احترام مسجد گاہ قدسیاں کہاں محفوظ رہ سکیں گے۔

زوال دولت عثمان زوال شرع ملت ہے عزیز و فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک
خدا را تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں نہ سمجھے اب تو پھر سمجھو گے تم یہ چیتاں کب تک
آخر میں متنبہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

جو گونج اٹھے گا عالم شور ناقوس کلیسا سے تو پھر یہ نعمہ توحید و گلبانگ اذیاں کب تک
کہیں اڑ کر یہ دامن حرم کو بھی نہ چھو آئیں غبار کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک
حرم کی سمت بھی صید افکنوں کی جب نگاہیں ہیں تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کے آشیاں کب تک
عالم اسلام کے حالات سے شبلی کس قدر دل برداشتہ تھے، ان کے اس شعر سے اندازہ
لگایا جاسکتا ہے:

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں

کہ اب امن و امان شام و نجد و قیرواں کب تک

عہد شبلی میں عالم اسلام کی جو حالت زار تھی موجودہ دور میں اس سے بھی زیادہ بدتر ہے
۔ یہی وجہ ہے کہ ایک صدی گزرنے کے باوجود شبلی کی نظم کی افادیت اور بڑھی ہے اور نہ صرف ماتم
خیزی میں اضافے کا سبب ہے بلکہ جوش عمل اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ بیدار کرتی ہے اور کیفی اعظمی
جیسے شاعر کو یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ:

زوال ملت اسلامیہ کے نوحہ خواں شبلی مبارک ہو کہ کروٹ لے رہا ہے آسماں شبلی

مٹائے گا ہمارا کون اب نام و نشان شبلی دھواں گرما چکا اڑنے کو ہیں چنگاریاں شبلی

لیا ہے یہ سبق ہم نے خود اپنے خوں شدہ دل سے ستم کی خو بدل سکتی نہیں فریاد بسمل سے
تڑپ کر چھین لیں گے تیغ اب ہم دست قاتل سے ہماری گردنوں پر اب نہ ہوگا امتحاں شبلی

وہ گل شعلہ بنے جس پر ستم کروٹ بدلتا تھا وہ رات آخر ہوئی جس میں چراغ ظلم جلتا تھا
ہمارا قصہ غم سن کے جن کا جی بہلتا تھا قریب ختم آ پہونچی اسی کی داستاں شبلی
کینی کے خیالات سے ہم اختلاف بھی کر سکتے ہیں لیکن ایک صدی گزرنے کے بعد
اس نظم کا جو ما حاصل ہو سکتا ہے۔ کینی کی نظم اسی ارتقا کا نمونہ ہے۔

علامہ شبلی کی سیاسی نظموں میں خیر مقدم ڈاکٹر مختار انصاری بھی ایک بڑی پراثر نظم ہے۔
ڈاکٹر انصاری غازی پور کے مایہ ناز فرزند تھے۔ جنگ بلقان کے زمانہ میں وہ طبی وفد لے کر ترکی
گئے تھے۔ ڈاکٹر مختار انصاری کے طبی وفد کی رواں گی کا ایک منظر جس سے علامہ شبلی کے جذبات و
احساسات کی عکاسی ہوتی ہے، مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

”ڈاکٹر انصاری صاحب لکھنؤ ہو کر روانگی کے لئے دلی جا رہے
ہیں۔ لکھنؤ کے چند ممتاز لوگ بھی الوداع کہنے کو موجود ہیں۔ گاڑی روانہ
ہونے کو ہے۔ مولانا پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ڈبہ کے
دروازے پر کھڑے ہیں۔ وداعی سلام کر رہے ہیں کہ دفعۃً اس ہمہ تن جوش
علامہ وقت کا وہ سر جو بڑے بڑے جباروں کے سامنے بھی نہیں جھکا تھا دفعۃً
ڈاکٹر انصاری کے بوٹ پر جھک گیا۔ آنسوؤں نے اس کے گرد و غبار کو دھو دیا
اور لب نے اس کے بوسے لئے اور گاڑی اسلامی غیرت و حمیت کے ان
گہر ہائے گراں مایہ کو لے کر آگے بڑھی۔“ (حیات شبلی ص ۴۶۱)

ڈاکٹر مختار انصاری واپس آئے تو علامہ شبلی بمبئی میں تھے۔ وہیں خیر مقدمی نظم لکھی اور

جلے میں پڑھی، جس کے ایک ایک شعر سے شبلی کی قومی درد مندی آشکارا ہے۔ ڈاکٹر مختار انصاری کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

مسلمانوں کے تم نے طالع واڑوں بھی دیکھے ہیں نئے سب انقلاب گردش گردوں بھی دیکھے ہیں
تمہارا درد دل سمجھیں گے کیا ہندوستان والے کہ تم نے وہ مظالم ہائے روز افزوں بھی دیکھے ہیں
تیموں کے سنے ہیں نالہ ہائے جاں گزرا تم نے زنان بے نوا کے چہرہ محروں بھی دیکھے ہیں
گھروں کو لوٹنے کے بعد زندوں کو جلا دینا بلا د مغربی کے یہ نئے قانون بھی دیکھے ہیں
آخر میں فرماتے ہیں:

سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی تو تم نے وہ رموز قوت کمنوں بھی دیکھے ہیں
عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر ابھر آئے کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں بھی دیکھے ہیں
علامہ شبلی ان نظموں کے ذریعہ مسلمانوں کی غم گساری کرتے ہیں اور اس انداز سے
کرتے ہیں کہ انگریزوں کی مسلم دشمنی واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے اور ان کا قومی و ملی نظریہ یہ
احساس دلاتا ہے کہ انگریزوں کے خلاف صف آرا ہونا چاہئے۔ دوسرے لفظوں میں یہ نظمیں
آزادی و حریت کی نقیب اور پیغام بر ہیں۔

۱۹۱۲ء میں مچھلی بازار کان پور کی مسجد کے وضو خانہ کے انہدام اور پھر مسلمانوں پر
گولیاں برسانے کی وجہ سے ملک میں انگریزوں کے خلاف غم و غصہ اور نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی
تھی۔ اس حادثہ پر علامہ شبلی نے کئی نظمیں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ ایک نظم کے چند اشعار
ملاحظہ ہوں:

کل مجھ کو چند لاشہ بے جاں نظر پڑے دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خور د سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادہ فنا جو خاک و خوں میں بھی ہم تن غرق نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم آئی یہ صدا ہم کشتگان معرکہ کان پور ہیں
سانحہ کان پور پر انھوں نے جو نظمیں لکھیں ان میں ان کی قومی حمیت و غیرت اپنے

شباب پر ہے۔ وہ خود خون کے آنسو روئے اور پورے ملک کو رلایا۔ حقیقی شاعری یہی ہے کہ جو جذبہ واثر شاعر کے دل پر ہو وہی جذبہ پڑھنے والے کے دل پر بھی قائم کر دے۔ اس دلدوز واقعہ کو انہوں نے مختلف شعری پیرایوں میں بیان کیا۔ انھیں خود پر افسوس تھا:

کہ شبلی بہمنی میں رہ کے محروم سعادت ہے

وہ فرماتے ہیں کہ: ”اس واقعہ سے مجھے اس قدر صدمہ پہنچا ہے کہ میری آنکھوں میں آنسو نہیں رہے اور جگر شق ہو گیا۔ اس کے باوجود میری رگوں میں جو چند قطرہ خوں بچا ہے۔ وہ کان پور کے زنجیوں کا حق ہے۔

اگرچہ آنکھ میں غم بھی نہیں ہے اب باقی اگرچہ صدمہ بلقان سے جگر شق ہے
بچار کھے ہیں مگر میں نے چند قطرہ خوں کہ کان پور کے بھی زنجیوں کا کچھ حق ہے
ان کا یہ شاعرانہ خیال بھی دلچسپ ہے کہ عدد اور ظہور میں رسول عرب کی قوم کم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان بلقان اور کان پور میں بے دردی سے شہید کئے جا رہے ہیں:

کیا پوچھتے ہو یہ کہ رسول عرب کی قوم کیوں گھٹ رہی ہے آج عدد میں ظہور میں
سن لو وہ گنجائے گراں مایہ دفن ہیں کچھ بیلقاں کی خاک میں کچھ کان پور میں
علامہ شبلی کے واقعہ گزند پا کا ذکر متعدد مقامات پر ہے۔ مگر کہیں انھوں نے اس پر اظہار تاسف نہیں کیا، لیکن جب علماء کو زنجیریں پہنائی گئیں تو اس پر انھوں نے کس قدر خوب صورت شاعرانہ تلخیص کی۔ فرماتے ہیں:

ہم قدم آپ کا ہونا تو بہت دشوار ہے ان کا کیا ذکر جو اس درد میں شامل ہی نہیں
پاؤں کٹنے کا مجھے آج ہوا ہے صدمہ یعنی افسوس میں زنجیر کے قابل ہی نہیں
شبلی کی ان نظموں سے آزادی و حریت کے جو جذبات براہیختہ ہو رہے تھے انگریزی حکام کی ان پر نظر تھی اور وہ شبلی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے اور بالآخر ان کی نظم ”جنگ یورپ اور ہندوستانی“ شبلی کی گرفتاری کا وجہ جواز قرار پائی لیکن چونکہ اس سے پہلے انھوں نے وفات پائی، اس لئے وہ اس سعادت سے محروم رہے۔ جنگ عظیم پر ان کی یہ نظم پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے:

ایک جرمنی نے مجھ سے کہا از رہ غرور آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں
 برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم اور اس پہ لطف یہ ہے کہ تیار بھی نہیں
 باقی رہا فرانس تو وہ رند لم یزل آئیں شناس شیوہ پیکار بھی نہیں
 میں نے کہا غلط ہے ترا دعویٰ غرور دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
 ہم لوگ اہل ہند ہیں جرمن سے دس گئے تجھ کو تمیز اندک و بسیار بھی نہیں
 سنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور پھر وہ کہا جو لائق اظہار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

علامہ شبلی کی شاعری کا ایک اہم موضوع مسلم لیگ ہے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم
 ہوئی تو اس کے مقاصد سے شبلی کو اختلاف تھا۔ لیگ کے طرز سیاست سے بھی وہ نالاں رہے۔ اس
 لئے انھوں نے اپنی شاعری میں اس پر سخت چوٹیں کیں۔

لیگ کی عظمت و جبروت سے انکار نہیں ملک میں ولولہ ہے شور بھی کہرام بھی ہے
 مختصر اس کے فوائد کوئی پوچھے تو یہ ہیں محسن قوم بھی ہے خادم حکام بھی ہے
 شبلی کانگریس کے حامی، دو قومی نظریہ کے مخالف اور ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے۔
 مسلم لیگ سے اختلاف کا اصل سبب ان کی یہ فکر تھی۔ اپنے معترضین کے جواب میں کہتے ہیں:
 معترض ہیں مجھ پہ مہربانان قدیم جرم یہ ہے میں نے کیوں چھوڑا وہ آئیں کہن
 میں نے کیوں لکھے مضامین سیاست پے بہ پے کیوں نہ کی تقلید طرز رہنمایان زمن
 کانگریس سے مجھ کو اظہار برأت کیوں نہیں کیوں حقوق ملک میں ہوں ہندوؤں کا ہم سخن
 مسلم یونیورسٹی اور ندوۃ العلماء پر بھی ان کی کئی نظمیں ہیں جو ان کی ملی درد مندی کا پتہ
 دیتی ہیں اور جن سے ان کے ملی احساسات و جذبات عیاں ہوتے ہیں۔ غالباً انھیں نظموں کی بنیاد
 پر پروفیسر آل احمد سرور نے شبلی کی شاعری کو کبھی کبھی کی موج قرار دیا ہے۔ (مولانا شبلی کا مرتبہ اردو
 ادب میں مقدمہ ص ۱۵) اور فی الواقع یہ صحیح بھی ہے مگر کبھی کبھی کی موج اپنے اندر کتنی شدت پوشیدہ

رکھتی ہے اور شبلی کی دریائے سخن کی موجوں نے کتنوں کو پیچ و خم اور گرداب سے نکالا اور ساحل مراد تک پہنچایا اس کا اندازہ مستقل لہروں کے اثرات سے لگایا جاسکتا ہے، شبلی کے جذبات کی شدت کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی سیاسی نظمیں آج بھی دلوں کو گرم اور دماغ کو مشتعل کرتی ہیں اور آئندہ بھی روح میں بالیدگی پیدا کرتی رہیں گی۔

مراسلات شبلی: ایک مطالعہ

علامہ شبلی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کی جامع کمال شخصیت کے متنوع پہلوؤں میں ایک اہم پہلو ان کی مراسلہ نگاری بھی ہے۔ انہوں نے وقتاً فوقتاً اخبارات و رسائل میں مراسلے لکھے۔ یہ مراسلے ۱۸۸۸ء سے ۱۹۱۴ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ ان کی معلوم تعداد ۲۴۲ ہے۔ ان میں بیشتر مراسلات کو مولانا سید سلیمان ندوی نے مقالات شبلی جلد ششم میں شامل کیا ہے، البتہ چند نو دریافت مراسلات کا ذکر اس مقالہ میں پہلی بار کیا جا رہا ہے۔ نو دریافت مراسلات درج ذیل ہیں:

الف لیلہ ولیلہ، ابن المقفع کا اسلام لانا، حرم محترم میں جامعہ اسلامیہ (یونیورسٹی) کی تجویز، تعطیل جمعہ، مولوی عبدالکریم کی معطلی، مدینہ یونیورسٹی کا نصاب تعلیم۔

علامہ شبلی کے یہ مراسلات اس لحاظ سے بے حد اہم ہیں کہ ان میں علم و تحقیق اور تصنیف و تالیف کے مختلف پہلوؤں کی نہ صرف نشاندہی کی گئی ہے بلکہ نئے نئے علمی و تعلیمی منصوبوں کے خاکے پیش کر کے ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اہل علم سے مشورے کئے گئے ہیں۔ بعض مراسلات کی حیثیت توضیحی ہے، ان میں انہوں نے ندوہ کے معاملات یا اس سے متعلق الزامات کی تردید یا وضاحت کی ہے۔ غرض علامہ شبلی کے مراسلات نہ صرف ان کی سوانح زندگی کے لحاظ سے بلکہ بعض قومی، ملی اور تعلیمی خدمات کے لحاظ سے بھی بے حد اہم ہیں۔ ان مراسلات کی ایک غایت یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ عام ہو جائیں، ملت کے ممتاز افراد و اشخاص بالخصوص ارباب کمال کی نظروں سے گزر جائیں اور ان پر بحث و مباحثہ ہو، اس کے بعد جو لائحہ عمل تیار ہو اس کو عملی جامہ پہنایا جاسکے۔

علامہ شبلی نے جو مراسلات لکھے ہیں ان کے عناوین یہ ہیں

۱۔ ابن رشد

۲۔ المامون

۳۔ الف لیلہ ولیلہ

۴۔ عبداللہ ابن المقفع کا اسلام لانا

۵۔ اشاعت کتب قدیمہ

۶۔ وقف اولاد کے مسئلہ کے متعلق ایک نہایت ضروری تحریک

۷۔ اجلاس ندوہ

۸۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مفصل اور مستند سوانح عمری

۹۔ نو مسلموں کو دوبارہ ہندو ہو جانے سے بچانے کے لئے تمام برادران اسلامی کی

خدمت میں فریاد

۱۰۔ مجلس علم کلام

۱۱۔ مورخین یورپ کی کذب بیانی

۱۲۔ تعطیل جمعہ

۱۳۔ حرم محترم (مکہ) میں جامعہ اسلامیہ (یونیورسٹی) کی تجویز

۱۴۔ مدینہ یونیورسٹی کا نصاب تعلیم

۱۵۔ مولانا عبدالباری کی شہادت

۱۶۔ مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی اور مولانا عبداللہ صاحب

۱۷۔ مولوی عبدالکریم کی معطلی

۱۸۔ اوقاف اسلامی

۱۹۔ ایک اہم تجویز (دارالمصنفین)

۲۰۔ ایک مذہبی مدرسہ اعظم کی عمارت کے لئے تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے

درخواست

۲۱۔ اسٹراک کا سبب کون تھا؟

۲۲۔ اصلاح ندوہ اور ہمدرد

۲۳۔ جلسہ دہلی کے متعلق ایک عام غلط فہمی کی تردید

۲۴۔ ترکوں کی اعانت

یہ مراسلات مختلف اخبارات و رسائل مثلاً مسلم گزٹ لکھنؤ، اخبار آزاد لکھنؤ، وکیل امرت سر، ہمدرد دہلی، زمیندار لاہور، الہلال کلکتہ، الہلال مصر اور ماہنامہ الندوہ لکھنؤ میں شائع ہوئے۔ یہاں ان کا اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ ابن رشد

علامہ شبلی کے اب تک جو مراسلات دریافت ہوئے ہیں ان میں پہلا مراسلہ ۱۸۸۸ء کا ہے جو اخبار آزاد لکھنؤ میں ۷ دسمبر ۱۸۸۸ء کو شائع ہوا ہے۔ یہ علامہ ابن رشد سے متعلق ہے۔ علامہ ابن رشد اور ان کے ہم عصر کے عنوان سے نواب عماد الملک سید حسین بگرامی [۱۸۴۳ء-۱۹۳۶ء] نے اردو گائڈ میں ایک طویل مضمون لکھا تھا جو ان کے مجموعہ مضامین ”رسائل عماد الملک“ میں بھی شامل ہے، جس میں انھوں نے اور باتوں کے علاوہ یہ بات بھی لکھی تھی کہ ابن رشد کے حالات اور کارناموں پر بہت کم معلومات دستیاب ہیں اور وہ اسلامی تاریخ میں ایک گم شدہ شخص ہے۔ علامہ شبلی نے اسے مسلمانوں کی تاریخی واقفیت پر بیجا حملہ قرار دیا اور یہ وضاحتی مراسلہ لکھ کر ابن رشد کے حالات اور کارناموں پر لکھی جانے والی متعدد تحریروں کی نشاندہی کی اور کئی کتابوں کے حوالے دئے۔ انہوں نے اخبار آزاد کے ایڈیٹر شوق قدوائی کو لکھا کہ

”میں نے اخبار آزاد مطبوعہ ۱۶ نومبر ۱۸۸۸ء میں وہ ریویو پڑھا

تھا جو آپ ”المأمون“ پر نہایت قابلیت سے لکھ رہے ہیں، اس ریویو میں آپ نے مثلاً ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے، جو آپ کے نزدیک مسلم اور بدیہی البتہ بن گیا ہے، یعنی یہ کہ امام ابو الولید ابن رشد جو مسلمانوں میں اسطو کا ہم پلہ تھا، اسلامی تاریخ میں ایک گم شدہ شخص ہے، ۱۲ اکتوبر ۱۸۸۸ء کے پرچہ میں بھی آپ نے اس کو مثلاً پیش کیا ہے اور جہاں تک مجھ کو یاد ہے ایک اور پرچہ میں بھی آپ نے اس واقعہ کو عبرت انگیز صورت میں دکھایا ہے۔

مسٹر سید حسین بلگرامی مخاطب بہ عماد الملک کا وہ مضمون جو ابن رشد اور اس کے معاصرین پر ہے، جب اول اول اخبار اردو گانڈ میں چھپا تو اس وقت مجھ کو گمان ہوا کہ اس خاص امر کی نسبت وہ بہت سے لوگوں کے لیے غلطی میں پڑنے کا باعث ہوگا، آپ مجھے معاف فرمائیے گا، اگر میں یہ کہوں کہ اس دام میں پہلے پھنسنے والے آپ تھے۔“ (مقالات شبلی ج ۸ ص ۴۷)

اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے علامہ شبلی نے یہ مراسلہ لکھا اور قدرے تفصیل سے ان کتابوں کے بارے میں وضاحت کی جن میں ابن رشد کے کارناموں کی تفصیلات موجود ہیں۔ بعد میں علامہ شبلی جب ماہنامہ الندوہ کے ایڈیٹر ہوئے تو ابن رشد پر ایک سلسلہ مضامین شروع کیا جس کی آخری قسط ان کی وفات کے بعد جون ۱۹۱۸ء میں ماہنامہ معارف میں شائع ہوئی۔

۲۔ المامون

۱۸۸۷ء میں علامہ شبلی کی معروف کتاب المامون شائع ہوئی تو اس پر متعدد اعتراضات وارد کئے گئے ان میں ایک اعتراض یہ تھا کہ خلیفہ مامون انتخاب کے قابل نہ تھا اور ہارون کو مامون پر ترجیح حاصل ہے۔

اس سلسلہ میں بعض علمی حلقوں کی جانب سے جب تنقید و اعتراض کی لے بڑھنے لگی تو اخبار آزاد لکھنؤ کے ایڈیٹر شوق قدوائی نے ان تنقیدوں کے جواب کے لئے علامہ شبلی کو متواتر خطوط لکھے۔ ان کے مسلسل اصرار پر علامہ شبلی نے ایک مختصر مراسلہ ان ہی کے نام لکھا۔ یہ مراسلہ اخبار آزاد میں ۲۲ فروری ۱۸۸۹ء کے ایڈیشن میں شائع ہوا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ علامہ شبلی کی یہ واحد تحریر ہے جو انھوں نے اپنی کسی تصنیف پر تنقید کے جواب میں لکھی ہے۔

اس مراسلہ میں انھوں نے مامون کے انتخاب پر جو اعتراضات کئے گئے تھے ان کا مسکت و مدلل جواب دیا۔ ان کا لہجہ اس میں ذرا سخت نظر آتا ہے جو شاید بعض معترضین کے اعتراض برائے اعتراض کے رویہ کے پیش نظر بے جا بھی نہیں کہا جاسکتا۔ انھوں نے لکھا کہ ”جن لوگوں نے اس بات کو طول دیا ہے کہ دولت عباسیہ میں

ہارون انتخاب کے لائق تھا نہ کہ مامون۔ اس اعتراض کا تعفیہ وہ شخص کر سکتا ہے جس نے نہایت وسعت کے ساتھ تاریخی معلومات فراہم کئے ہوں اور ساتھ ہی باریک بین اور تاریخی اصولوں کا کلتہ شناس بھی ہو۔“

(مقالات شبلی ج ۸ ص ۴۱)

اس کے بعد انھوں نے ہارون رشید کے انتخاب نہ کرنے کے متعدد اسباب بیان کئے ہیں اور لکھا ہے:

”اگرچہ مجھ کو زیبا نہیں کہ مرحوم ہارون الرشید کی فرد قرار داد جرم تیار کروں لیکن اگر ہمارے دوستوں کے خزانہ معلومات میں المامون اور تاریخ الخلفاء کے سوا اور بھی کچھ ہے تو خیال کریں کہ وہ کون تھا جس نے سرحدی شہروں کے تمام گرجے بعض بیجا تعصب سے منہدم کرادیے؟ کون تھا جس نے اپنے قید خانہ کو بعض شبہ کی بناء پر حضرت موسیٰ کاظم سے آباد کیا تھا؟ کون تھا جس کے درباری اس کی بد مزاجی سے اس قدر خائف رہتے تھے کہ اکثر اس کے پاس کفن پہن کر جاتے تھے؟ کون تھا جس نے حضرت یحییٰ بن عبد اللہ کو معاہدہ صلح لکھ دیا جس پر تمام علماء اور بنو ہاشم کے دستخط تھے۔ پھر بے وجہ ان کو قید کر دیا؟ اور گوامام محمد صاحب نے کہا بھی کہ یہ بالکل اسلام کے خلاف کارروائی ہے مگر باز نہ آیا۔ کون تھا جس کے عہد میں عمال اور عہدہ داران ملکی اعلانیہ ظلم کرتے تھے اور سال بھر میں ایک بار بھی مظلوموں کی فریاد سننے کو دربار نہیں کرتا تھا؟ کون تھا جس کو قاضی ابو یوسف نے نہایت حسرت اور تمنا سے کتاب الخراج میں یوں مخاطب کیا:

”اگر اے امیر المومنین تو خدا کا تقرب اس طرح حاصل کرتا کہ ریا عا کی فریاد سننے کے لئے مہینہ بلکہ دو مہینہ میں ایک اجلاس بھی کرتا جس میں تو مظلوم کی فریاد سنتا اور ظالم سے باز پرس کرتا تو مجھ کو امید تھی کہ تیرا شمار ان لوگوں میں نہ ہوتا جو رعایا کی حاجتیں نہیں سنتے اور غالباً تو دو ایک ہی

اجلاس کرے گا ملک میں یہ چہ چا پھیل جائے گا کہ تو برس دن میں ایک بار بھی لوگوں کی حاجت روائی کے لئے اجلاس کرتا ہے تو وہ لوگ ان شاء اللہ ظلم سے باز رہیں گے۔“ کون تھا جس کے عہد میں اکثر واقعہ نویس عمالوں سے سازشیں رکھتے تھے اور بالکل جھوٹ اور فساد انگیز خبریں ہارون الرشید کو لکھتے تھے؟ جس کی وجہ سے قاضی ابویوسف نے مجبور ہو کر کتاب الخراج میں اس کا ذکر کیا۔ کون تھا جس کے عہد میں ملک کی تباہی کا یہ حال تھا کہ سواد کے علاقہ میں حضرت عمرؓ نے جو خفیف رقم مقرر کی تھی رعایا اس کو بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی اور آخر قاضی ابویوسف صاحب کو وہ مقدار جمع گھٹا کر اس کی توجیہ کرنی پڑی۔ کون تھا جس کا خزانہ اس طرح معمور کیا جاتا تھا کہ جب کسی پر کچھ شبہ ہوا تو اس کا کل مال و متاع ضبط کر کے خزانہ شاہی میں داخل کر دیا گیا؟ علی بن عیسیٰ سے دس کروڑ درہم چھین کر جو خزانہ میں داخل کئے گئے کیا جائز حق سے لئے گئے۔ کون تھا جس نے اسلام میں یہ نئی بدعت ایجاد کی کہ خلافت کے چند ٹکڑے کئے اور اپنے بیٹوں میں اس کو موروثی جائیداد کی طرح تقسیم کیا؟ کیا ان باتوں کے ہم پلہ مامون کی تاریخ میں بھی مل سکتی ہیں۔..... فتوحات کے لحاظ سے رشید کو کیا ترجیح ہے؟ مختصر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ رشید نے کوئی نیا ملک فتح نہیں کیا لیکن مامون کے عہد میں صقلیہ اور کریم کی جو فتوحیں ہوئیں، وہ خاص لحاظ کے قابل ہیں۔ علم و قابلیت کے لحاظ سے سب جانتے ہیں کہ ہارون رشید صرف ادب، فقہ، حدیث میں کمال رکھتا تھا لیکن مامون ان علوم کے علاوہ فنون حکمت کے مختلف شعبوں میں ایک حکیم تسلیم کیا جاتا تھا۔“ (مقالات شبلی ج ۸ ص ۴۲-۴۳)

اس کے بعد علامہ شبلی معترضین پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”افسوس ہے کہ نہ لوگوں کو تمام حالات سے اطلاع نہ واقعات کے موازنہ کرنے کی قابلیت۔ یہ امور جو میں نے لکھے ہیں شاید لوگوں کو چیتاں

معلوم ہوں اور تاریخی دفتروں میں اس کے حوالے بھی نہ ڈھونڈ سکیں۔“
(مقالات شبلی ج ۸ ص ۴۲-۴۳)

ایڈیٹر آزاد کو مخاطب کر کے لکھا کہ:

”رشید کی برائیاں میں نے کم گنائیں۔ رنج ہوتا ہے کہ سیکڑوں برس کے دبے فتنے آج ابھارے جائیں۔ خیر رشید جو کچھ تھا خوب تھا۔ ان طرف داروں سے اس کا حق مجھ پر زیادہ ہے۔ میں نے کچھ سمجھ کے اس کو نہیں لیا۔ مامون پر جو نکتہ چیںیاں کی گئی ہیں، وہ اسی طرح تفصیل طلب ہیں جس طرح رشید و مامون کا موازنہ۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے اوقات کو ان فضول باتوں میں صرف کروں؟ آپ یقین فرمائیں کہ مجھ کو عام لوگوں کی تحسین سے نہ خوشی ہوئی، نہ ان کے اعتراض سے رنج۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگ اعتراض کریں آپ کا جی چاہے تو ان کے جواب کی طرف متوجہ ہوں۔ مجھ کو چھوڑ دیجئے کہ رائل ہیروز کے باقی حصے پورے کروں۔

رسی آنگہ بدر دمن کہ چومن

خانہ گیری و حرف بنگاری

(مقالات شبلی ج ۸ ص ۴۴)

اس مراسلہ سے ہمیشہ کے لئے یہ برحق فیصلہ ہو گیا کہ مامون کے انتخاب پر جو انگشت نمائی کی گئی تھی وہ کسی طرح درست نہ تھی۔

۳۔ الف لیلہ و لیلہ

علامہ شبلی کے زیر مطالعہ عربی اخبارات و رسائل رہا کرتے تھے اور وہ ان میں مراسلے بھی لکھا کرتے تھے۔ حال ہی میں ان کے دو عربی مراسلے جو جرجی زیدان کے رسالہ الہلال مصر میں شائع ہوئے تھے جناب ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحي صاحب کو ملے ہیں۔ یہ دونوں مراسلے دراصل استدراک ہیں۔ پہلے مراسلہ میں کتاب الف لیلہ و لیلہ کا ذکر ہے۔ الہلال کے

ایک مراسلہ نگار حکمت بک شریف نے اس کتاب کو یونانی الاصل قرار دیا تھا اور یہ دلیل پیش کی تھی کہ اس میں قہوہ کا ذکر ہے اور قہوہ اس زمانہ میں موجود نہیں تھا۔ علامہ شبلی نے اپنے مراسلہ میں حکمت بک شریف کے موقف اور ان کے دلائل کی تردید کی ہے۔ انہوں نے پہلے مسعودی کی مروج الذہب اور ابن ندیم بغدادی کی الفہرست کے حوالہ سے عربی تراجم کا ذکر کیا ہے اور متعدد مترجمہ کتب کی تفصیل پیش کی ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ

ان تمام تفصیلات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اصلاً فارسی سے منقول ہے اور بعض لوگوں کو جو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ یونانی الاصل ہے وہ صحیح نہیں بلکہ صرف ظن و تخمین ہے۔ اس قصے کی جو اصل ہے وہ تو فارسی ہے۔ ہاں اس میں الحاقات بھی بہت ہوئے ہیں اور غالباً یہ الحاقات جوشیاری وغیرہ کے اس موضوع کے نسخوں سے کئے گئے ہیں۔ آپ کے مایہ ناز رسالہ الہلال میں فاضل مراسلہ نگار حکمت بک شریف نے جو یہ دلیل دی ہے کہ اس میں متعدد مقامات پر قہوہ کا ذکر آیا ہے جبکہ قہوہ اس زمانہ میں موجود نہیں تھا تو یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ قہوہ قدیم زمانہ میں شراب کے معنی میں استعمال ہوتا تھا اور یہ مشہور بات ہے۔ (الہلال مصرع ۷ شمارہ ۱، دسمبر ۱۸۹۵ء ص ۲۵۴)

۴۔ عبداللہ ابن المقفع کا اسلام لانا

دوسرا مراسلہ عبداللہ ابن المقفع کے اسلام لانے کے متعلق ہے۔ عربی مجلہ المقتطف میں اہل علم کے درمیان یہ بحث تھی کہ عبداللہ ابن المقفع مجوسی تھے یا مسلمان؟ علامہ شبلی نے اس بحث پر تعجب کا اظہار کیا اور لکھا کہ:

”بخدا مجھ کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ مسئلہ نامور ادباء کی معرکہ آرائی اور فکری جنگ کا موضوع بن جانے کا اہل ہے اور طرفہ تماشہ یہ کہ اس باب میں جو طریقہ استدلال اختیار کیا ہے، وہ اور بھی حیرت ناک ہے۔ اور کیوں نہ ہو جب امیر شکیب ارسلان جیسے نامور فاضل کی نگاہوں سے ابن خلکان کی

عبارتیں پوشیدہ رہ جائیں اور فادر لولیس شیخو جیسا دانشور جن کو تسلیم کرنے سے گریز کرے اور نسیان کا سہارا لے اور المقتطف کے ایڈیٹر جیسا فلسفی محض زندقہ کے اتہام کی بنا پر ابن المقتفع کو نصرانی بتانے لگے اور یہ کہنے لگے کہ زندقہ دراصل مجوسیت کا نام ہے اور اکثر مجوسیوں نے یا تو عیسائیت اختیار کر لی یا عیسائیت کی طرف مائل ہو گئے۔“ (الہلال مصرج ۷، ۱، ۱۵ یونیو ۱۹۰۰ء ص ۵۵۹)

علامہ شبلی نے اس صورت حال کا جائزہ لیا ہے اور ابن المقتفع کے اسلام لانے کا ذکر کیا ہے اور اپنے موقف کی تائید میں ابن الندیم، شریف رضا مرتضیٰ، اور صنعانی وغیرہ کی کتابوں کے اقتباسات سے استدلال کیا ہے، پھر زندقہ کے الزام کی تردید کی ہے۔ اس سلسلہ میں ابن الندیم کی الفہرست سے بھی استدلال کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ:

”اصل بات یہ ہے کہ اسلام کی ابتدائی دو صدیوں میں عام طور پر فلسفہ اور عقلی علوم کو ناپسند کیا جاتا تھا پس جس شخص کا زیادہ میلان اور توجہ ان علوم کی طرف لوگ دیکھتے تھے اس کو زندیق کہہ کر پکارتے تھے، ابن المقتفع کا معاملہ یہ بھی ہے کہ اس نے بہت سے مجوسی زندیقیوں کی کتابوں کے ترجمے بھی کئے جیسا کہ مسعودی نے مروج الذهب میں صراحت کی ہے۔ المقتطف کے ایڈیٹر کی یہ دلیل کہ اس نے یونانی علوم کے ترجمے کئے جس سے اس کی نصرانیت کا پتہ چلتا ہے، یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ اس نے جن یونانی علوم کا ترجمہ کیا ہے وہ دراصل یونانی سے نہیں کیا ہے بلکہ اس کے فارسی ترجمہ سے کیا ہے۔ صاحب کشف الظنون نے لفظ حکمت کے ذیل میں اس کی تصریح کی ہے۔“ (ایضاً ص ۵۶۰)

۵۔ اشاعت کتب قدیمہ

اشاعت کتب قدیمہ کے سلسلہ میں علامہ شبلی نے پہلے محمد بن ایٹکلو اور نینیل کا لیمگزین

کی ادارت کے زمانہ میں ایک نوٹ لکھا تھا پھر اسے ۳۱ اپریل ۱۸۹۶ء کو مراسلہ کی شکل میں اخبار آزاد لکھنؤ میں شائع کرایا۔ اس میں انہوں نے قدیم مراجع کی اشاعت پر زور دیا ہے اور ان کی نشاندہی کی ہے اور لکھا ہے کہ

”کس قدر تعجب کی بات ہے کہ مثلاً فقہ حنفی کا تمام تر دار و مدار امام محمد کی روایات و تصنیفات پر ہے، جن کو اصطلاح فقہ میں ظاہر الروایہ کہتے ہیں، لیکن آج ان میں سے بجز جامع صغیر کے جو نہایت مختصر اور سب سے چھوٹی ہے۔ ایک کتاب بھی موجود نہیں، یہاں تک کہ قسطنطنیہ اور مصر کے عظیم الشان کتب خانے بھی ان سے خالی ہیں، اسی طرح فلسفہ اور منطق میں مسلمانوں کو جن ناموروں پر ناز ہو سکتا ہے، وہ یعقوب کندی، فارابی، ابن رشد ہیں، لیکن ان کے تصنیفات اس قدر نایاب ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ قرآن مجید کے اعجاز و فصاحت و بلاغت پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے تمام ہندوستان میں ایک کتاب بھی موجود نہیں۔ تاریخ کی قدیم اور نادر تصنیفات تو گویا ہمارے ملک میں سرے سے آئی ہی نہیں۔ بعض قدیم کتابیں جو یورپ میں چھپی ہیں، لیکن قطع نظر ان کے گراں قیمت ہونے کے ہر شخص کو، ہم نہیں پہنچ سکتیں، ان واقعات کی بنا پر مجھ کو یہ خیال آیا کہ ایک مجلس قائم کی جائے، جو اس مفید اور اہم کام کو انجام دے۔ (مقالات شبلی ج ۸ ص ۵۳)

اس مجلس میں درج ذیل تین قسم کے ممبروں کے علامہ شبلی خواہش مند تھے:

۱- وہ لوگ جو ۱۱ روپیہ سالانہ چندہ دینا منظور فرمائیں اور یہی لوگ اراکین مجلس قرار دئے جائیں گے اور ان کو امور انتظامی مجلس میں رائے دینے کا حق حاصل ہوگا اور نیز جو کتاب یا کتابیں چھاپی جائیں گی گو کہ ان کی قیمت ان کے چندہ ممبری سے زائد ہو ان کو دی جائیں گی۔

۲- وہ اہل علم جو اس کام میں اپنی رائے اور اپنی واقفیت و تلاش سے امداد دیں اور اس قسم کی کتابوں کو، ہم پہنچائیں، ان کو یہ حق حاصل ہوگا کہ

مجلس ان کو تمام تجویزات اور حالات سے وقتاً فوقتاً مطلع کرتی رہے گی اور ایک یاد دہانہ کتاب مطبوعہ کا ان کو نذر کرے گی۔

۳۔ وہ لوگ جو یہ منظور کریں کہ کتاب چھپنے پر ایک نسخہ قیمت معینہ پر خرید لیں گے، ان بزرگوں کا نام رجسٹر میں درج کر لیا جائے گا اور جو کتاب چھپے گی، اس کا ایک نسخہ ان کی خدمت میں ویلوپے اسٹیل بھیج دیا جائے گا۔
(مقالات شبلی ج ۸ ص ۵۴)

علامہ شبلی جن کتابوں کی فوری طور پر اشاعت کے خواہش مند تھے ان کے نام یہ ہیں:

اعجاز القرآن للامام باقلانی، طبقات الشعراء لابن قتیبہ، مناقب الشافعی للامام الرازی، مجموعہ رسائل فارابی، جس میں ۱۵ رسالے شامل ہیں، تلخیص المثال ابن رشد مطبوعہ یورپ، عمدہ لابن رشید القیر وانی، تاریخ صغیر امام بخاری۔ (مقالات شبلی ج ۸ ص ۵۴-۵۵)

لیکن اشاعت کتب قدیمہ کی مجلس وہ قائم نہ کر سکے، اس سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ

”قدیم عربی کتابوں کی اشاعت کی تجویز انہوں نے ۱۸۹۶ء میں پیش کی تھی گو وہ اس وقت پوری نہیں ہوئی لیکن عجیب بات ہے کہ جن قلمی کتابوں کی اشاعت کا نام انہوں نے لیا تھا ان میں سے ایک (مناقب شافعی للرازی) کے سوا سب کتابیں ان کی زندگی میں چھپ گئیں۔“ (مقالات شبلی ج ۸ ص ۱۰)

۶۔ وقف اولاد کے مسئلہ کے متعلق ایک نہایت ضروری تحریک

انگریز جج وقف علی الاولاد کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور عدالتوں میں وقف علی الاولاد کے مقدمات میں اسلامی قانون کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے متعدد وقف املاک برباد ہوئیں۔ علامہ شبلی اسے مسلمانوں کا بہت بڑا ضیاع خیال کرتے تھے چنانچہ یہ مراسلہ لکھ کر انہوں نے اس کے خلاف ایک تحریک شروع کی جس میں انہوں نے فوری طور پر ایک رسالہ وقف

علی الاولاد لکھا جس میں شریعت کے مطابق وقف علی الاولاد کے مسئلہ کو واضح کیا۔ پھر تمام ہندوستان کے ائمہ و مفتیان کرام کو خطوط لکھے اور ان کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں ملک میں ہر طرف یہ تحریک اور اس کے اغراض و مقاصد پھیل گئے اور اس تحریک کی اہمیت کا احساس عام ہوا۔ چنانچہ علامہ شبلی نے جب اپنے موقف کی تائید میں اہل علم کے دستخط چاہے تو بے شمار لوگوں نے تائید کی اور دستخط کئے۔ اسی کی روشنی میں مسٹر محمد علی جناح نے پارلیامنٹ میں اس مسئلہ کو پیش کیا جسے بالآخر حکومت نے منظور کرتے ہوئے قانونی شکل دی۔ اس طرح علامہ شبلی کو اس مسئلے میں بڑی کامیابی ملی۔

۷۔ اجلاس ندوہ

علامہ شبلی نے یہ مراسلہ ندوہ کے ۱۹۱۱ء کے اجلاس کے لئے اس کے ارکان کے پاس لکھا تھا۔ یہ مراسلہ مکاتیب شبلی میں مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اور مکتوبات شبلی میں مولوی قیام الدین بخت جون پوری کے نام درج ہے۔

اس مراسلہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی ندوہ کے ارکان کے انتخاب میں بھی پوری دلچسپی لیتے تھے۔ اور اس کے لئے فراخ دلی کے ساتھ اہل علم اور ارباب کمال کی نشاندہی بھی کرتے تھے۔ جس میں ان کا نقطہ نظر مسلک سے بھی بالاتر ہوتا تھا۔ مثلاً اس مراسلہ میں انہوں نے مولانا لطف اللہ مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد، مولانا ابوبکر شہاب عرب اور مولانا حمید الدین فراہی کے علاوہ مولانا عبد الجبار غزنوی، مولانا عبد اللہ غازی پوری اور مولانا ثناء اللہ امرت سہری کا نام قابل انتخاب قرار دیا ہے۔ (مکتوبات شبلی ص ۱۰۹، ادبی دائرہ اعظم گڑھ)

۸۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مفصل اور مستند سوانح عمری

علامہ شبلی کے دل میں گونا گوں وجوہ سے جب سیرت نبوی کی تالیف و تدوین کا خیال آیا تو انہوں نے ماہنامہ الندوہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مفصل اور مستند سوانح عمری کی ضرورت کے عنوان سے ایک مراسلہ لکھا۔ جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوا ہے:

”کیا عجیب بات ہے! ہندوستان میں چھ کروڑ مسلمان ہیں، مشرقی علوم و فنون ابھی تک زندہ ہیں، نہایت لائق اور قابل فخر انشا پر داموجود ہیں، ملکی زبان نے ایسی قابل قدر تصنیفات پیش کیں کہ روم و مصر میں مضمون کے لحاظ سے ان کا جواب نہیں، قومی روایات کا مذاق بچہ بچہ کی رگ میں ہے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قدیم اور جدید دونوں گروہ کو یہ عقیدت و نیاز ہے کہ آپ کے نام پر جان و مال قربان کر دینا کوئی بات نہیں۔ یہ سب ہے لیکن اتنی بڑی وسیع قوم اور اتنی عالم گیر زبان (اردو) میں جناب رسول اللہ ﷺ کی کوئی سوانح عمری نہیں، یا ہے تو ایسی ہے کہ اس کو سیرت نبوی کہنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کو آزر دہ کرنا ہے، سیرت نبوی کی ضرورت اس لحاظ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ قوم میں جدید تعلیم وسعت سے پھیلی جاتی ہے اور یہی جدید تعلیم یافتہ گروہ ایک دن قوم کی قسمت کا مالک ہوگا، یہ گروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی اگر جاننا چاہتا ہے تو اردو میں کوئی مستند کتاب نہیں ملتی، اس لیے اس کو چارنا چار انگریزی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، جن میں یا تعصب کی رنگ آمیزیاں ہیں یا ناواقفیت کی وجہ سے ہر موقع پر غلطیاں ہیں۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ سیرت نبوی کی ضرورت پہلے صرف تاریخی حیثیت سے تھی، لیکن اب عقائد کی حیثیت سے بھی ہے، یورپ جو اسلام پر نکتہ چینی کرتا ہے، زیادہ تر اس بنا پر کرتا ہے کہ بانی اسلام کے اخلاق و عادات و تاریخ زندگی ایسی نہیں کہ ان کو خدا کا بھیجا ہوا معصوم پیغمبر کہا جاسکے۔“ (مقالات شبلی ج ۸ ص ۴۰-۴۱)

علامہ شبلی کے اس مراسلہ کا اثر یہ ہوا کہ ہر طرف سے سیرت نبوی کی تالیف کے لئے آوازیں بلند ہوئیں سب سے پہلے ایک خاتون نے چندہ بھیجا پھر بھوپال سے نواب حمید اللہ خاں نے کتابوں کی خریداری کے لئے یکمشت ہزار روپے بھیجے۔ پھر بیگم بھوپال نے اس کی مستقل ذمہ

داری لے لی۔ غرض اس مراسلہ نے ہر باشعور شخص کو سیرت نبوی کی طرف متوجہ کر دیا اور علامہ شبلی نے بڑے پیمانہ پر سیرت نبوی کے کام کا آغاز کیا جس کے نتیجہ میں سیرت نبوی کی دو جلدیں علامہ شبلی کے قلم سے نکلیں اور اسی پر ان کی زندگی کا خاتمہ ہوا اور ان کا یہ قطع سچ ثابت ہوا:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالآخر ہونا تھا

علامہ شبلی کے اس مراسلے کا علی العموم استقبال ہوا مگر ایک آواز اس کے خلاف بھی بلند ہوئی۔ مولوی انشاء اللہ خاں ایڈیٹر الوطن لاہور نے لکھا کہ چونکہ سیرت نبوی کے لئے مولانا محمد سلیمان منصور پوری قلم اٹھا چکے ہیں اس لئے علامہ شبلی کو زحمت کی ضرورت نہیں۔ (دیباچہ رحمت للعالمین ص ۷) سیرت نبوی سے متعلق اس نامناسب آواز کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔

اس مراسلہ کا عام اثر یہ ہوا کہ اردو میں سیرت نبوی کے مطالعہ و تحقیق کا ایک عام سلسلہ شروع ہوا اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی ”ان کی سیرت نبوی کی تجویز ایسی سرسبز ہوئی کہ آج ہماری زبان اس مقدس لٹریچر کی فراوانی، بلندی اور افادیت پر بجا فخر کر سکتی ہے۔“

(مقالات شبلی ج ۸ ص ۶)

۹۔ نو مسلموں کو دوبارہ ہندو ہو جانے سے بچانے

کے لئے تمام برادران اسلام کی خدمت میں فریاد

شدھی تحریک کے زیر اثر راجپوتانہ اور بعض دوسرے علاقوں میں نو مسلموں کے دوبارہ ہندو ہونے کی خبروں کا آغاز ۱۹۰۸ء میں ہوا علامہ شبلی اس خبر سے تڑپ اٹھے۔ چنانچہ اس کے تدارک کے لئے انہوں نے شاہ جہاں پور اور رائے بریلی وغیرہ کا دورہ کیا۔ راجپوتانہ میں اپنے معتمد بھیجے کہ آریوں اور ان کی شدھی تحریک کا سد باب کیا جاسکے اور کاموں کے ساتھ علامہ شبلی اس

کام میں بھی مسلسل لگے رہے۔ ۱۹۱۲ء میں ندوہ کے جلسہ میں اسے ایک ملی مسئلہ کی شکل میں پیش کرنے کی غرض سے یہ مراسلہ لکھا۔ اس میں ارتداد کی تفصیل کے ساتھ اس کے تدارک کی چند تجویزیں بھی پیش کی ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ

”جو تدبیریں اس وقت خیال میں آئیں ہیں وہ اس غرض سے پیش کی جاتی ہیں کہ تمام حضرات کو ان پر غور اور فکر کا موقع ملے، وہ تدبیریں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اس قسم کے واعظ مقرر کیے جائیں جو دو دو چار چار مہینے ایک گاؤں میں رہ کر لوگوں کو اسلام کے احکام سکھائیں، اس قسم کے واعظوں کے تیار کرنے کا خاص انتظام ہونا چاہیے۔

۲۔ دو دو چار چار گاؤں کے بیچ میں ابتدائی مدرسے قائم کیے جائیں، جن میں قرآن شریف اور اردو کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ صوفی وضع لوگ بھیجے جائیں، جن کا اثر عوام پر خود بخود پڑتا ہے۔

۴۔ مسلمانوں کے دیہات میں جو سرکاری ابتدائی مدرسے ہیں، کوشش کی جائے کہ ان کے مدرسین مسلمان مقرر ہوں۔ اب تک اکثر ہندو مدرس مقرر ہوتے ہیں اور اس لیے بچوں کو اسلام کی طرف رغبت نہیں ہو سکتی، غرض یہ ایک نہایت اہم مذہبی اور قومی مسئلہ ہے، اس کو نہایت غور، فکر اور جدوجہد سے حل کرنا چاہیے، اگر مسلمان ایسے خطرہ کی پرواہ نہیں کرتے تو ان کو اسلام کا نام نہیں لینا چاہیے۔ (مسلم گزٹ، ۱۱ مارچ ۱۹۱۲ء)

اسی فتنہ ارتداد کے سدباب کے لئے انہوں نے اشاعت اسلام کا منصوبہ بنایا اور بڑے پیمانہ پر تحریک کا آغاز کیا مگر ندوہ کے خلفشار اور قلیل مدت حیات نے اسے عملی جامہ پہنانے کا موقع نہیں دیا اور تحریک حفاظت و اشاعت اسلام کا کام آگے نہ بڑھ سکا۔

۱۰۔ مجلس علم کلام

علامہ شبلی طویل غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ جدید علم کلام بالکل نامکمل اور ناقص ہے۔ اور اس کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ ”مجلس علم کلام“ بنائی جائے، چنانچہ انہوں نے ۴ مارچ ۱۹۱۲ء کے مسلم گزٹ لکھنؤ میں مجلس علم کلام قائم کرنے کے لئے ایک مفصل مراسلہ لکھا اور اس کی ضرورت پر تفصیل سے روشنی ڈالی، اور ایک کمیٹی قائم کرنے کی تجویز پیش کی، انہوں نے لکھا کہ

اس کمیٹی میں قدیم علما اور جدید تعلیم یافتہ دونوں گروہ کے لوگ ممبر ہوں، قدیم علما اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ جو عقائد اور مسائل فلسفہ کے خلاف بیان کیے جاتے ہیں، ان میں سے کون سے مسائل درحقیقت اسلام کے اصل عقائد ہیں اور کون سے نہیں، جدید تعلیم یافتہ گروہ اس بات کا فیصلہ کر سکے گا کہ جن چیزوں کو فلسفہ کے مخالف کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت فلسفہ کے مخالف ہیں بھی یا نہیں اور اگر ہیں تو فلسفہ کی تحقیقات کہاں تک یقینی اور قطعی ہے، اس کمیٹی کے لیے بزرگان ذیل انتخاب ہو سکتے ہیں۔

علماء

۱۔ مولوی مفتی محمد عبداللہ صاحب ٹوکی

۲۔ مولانا مولوی شیر علی صاحب حیدر آباد، سابق مہتمم دارالعلوم

ندوہ

۳۔ سید محمد رشید رضا صاحب مصری، ایڈیٹر ”المنار“

(جدید تعلیم یافتہ)

۱۔ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب بیرسٹر

۲۔ مولوی حمید الدین صاحب عربی پروفیسر یونیورسٹی الہ آباد

۳۔ مولوی عبدالقادر صاحب بی. اے. بھاگل پوری

ہم کو خوشی ہے کہ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب نے اس مجلس کی ممبری منظور کر لی ہے اور صاحبوں نے ابھی خط کا جواب نہیں دیا، لیکن امید ہے کہ کسی کو اس عمدہ کام کی شرکت سے انکار نہ ہوگا۔

ہم چاہتے ہیں کہ ملک کے اور حضرات جن کو اس تجویز سے دلچسپی ہو، ہم سے خط و کتابت کریں، جلسہ سالانہ ندوۃ العلماء میں یہ تجویز پیش کی جائے گی اور جو فیصلہ ہوگا، اس کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ (مقالات شبلی ج ۸ ص ۶۲-۶۳)

مگر یہ مجلس بقول مولانا سید سلیمان ندوی ”خط و کتابت سے آگے نہیں بڑھی۔“
(مقالات شبلی ج ۸ ص ۱۰)

۱۱۔ مورخین یورپ کی کذب بیانی

یہ مراسلہ کسی اخبار یا رسالہ میں نہیں لکھا گیا بلکہ دفتر سیرت نبوی سے وابستہ اہل قلم کے نام لکھا گیا تھا۔ ان میں پروفیسر عبدالقادر، مولوی ریاض حسن خاں خیال، ایم مہدی حسن افادی اور مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اس لئے کہ یہ مراسلہ ان کے نام مکاتیب شبلی میں درج ہے۔ اس کا بنیادی مقصد سیرۃ النبی سے متعلق انگریزی کتابوں کے ان حصوں کا ترجمہ تھا جن میں مصنفین یورپ نے کذب بیانی سے کام لیا تھا۔ علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ

”سیرت نبوی جو زیر تصنیف ہے، میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے مصنفین نے جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھا ہے اس سے پوری واقفیت حاصل کی جائے تاکہ ان کے تائیدی بیان حسب موقعہ حجت الزامی کے طور پر پیش کیے جائیں اور جہاں انھوں نے غلطیاں اور بددیانتیاں کی ہیں، نہایت زور و قوت کے ساتھ ان کی پردہ دری کی جائے۔ اسی بنا پر انگریزی کی کثرت سے تصنیفات مہیا کی گئی ہیں، جو آنحضرت ﷺ کے متعلق تصنیف ہو چکی ہیں، لیکن ان سب کا اردو میں ترجمہ

کرنا ناممکن ہے، اس لیے یہ رائے قرار پائی ہے کہ جن صاحبوں کو اس سے ذوق ہو، ان کے پاس ایک ایک کتاب بھیج دی جائے، وہ مطالعہ کر کے قابل ترجمہ مقامات پر نشانات کرتے جائیں اور پھر کتاب واپس بھیج دیں تاکہ دفتر کے مترجمین سے ترجمہ کرایا جائے۔

اس بنا پر آپ سے درخواست ہے کہ کیا آپ بھی اس کام میں حصہ لینا پسند فرمائیں گے۔“ (مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۱۶۳-۱۶۴)

ترجمہ کے اس کام میں متعدد اہل علم نے حصہ لیا، اس میں ایک نمایاں نام مولانا عبدالمجاہد دریابادی کا بھی ہے۔

۱۲۔ تعطیل جمعہ

یہ مراسلہ مولانا ظفر علی خاں کے اخبار زمیندار [۱۰/۱۰ اپریل ۱۹۱۳ء] میں شائع ہوا ہے۔ اس میں دراصل اس بات پر بحث ہے کہ نماز جمعہ کی ادائیگی کے لئے جمعہ کے دن ایک گھنٹے کی چھٹی ہونی چاہئے یا آدھے دن کی۔ علامہ شبلی آدھے دن کی چھٹی کے حامی تھے۔ دونوں میں کس پر عمل کیا جائے یا دونوں میں کون بہتر ہے۔ یہ طے کرنے کی غرض سے مراسلہ لکھا گیا ہے۔ علامہ شبلی نے بڑے پیمانہ پر تعطیل جمعہ کی تحریک چلائی تھی۔ اس دوران بنگال کونسل میں تعطیل جمعہ کے لئے دو گھنٹہ کی رخصت کی تجویز منظور ہوئی اس کے بعد علامہ شبلی نے یہ مراسلہ لکھا۔ اس مراسلے پر کوئی بحث ہوئی یا نہیں اس کے بارے میں تفصیلات دستیاب نہیں۔ پھر علامہ شبلی نے وفات پائی اور یہ کام پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

۱۳۔ حرم محترم میں جامعہ اسلامیہ (یونیورسٹی) کی تجویز

یہ مراسلہ بھی زمیندار لاہور [۱۵/۱۰ اپریل ۱۹۱۳ء] میں شائع ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے مکہ مکرمہ میں ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پیش کی ہے۔ اور آخر میں لکھا ہے کہ میں بے ایس ضعف اور شکستہ پائی یہ کر سکتا ہوں کہ اس تحریک کے لیے

تمام ہندوستان کا دورہ کروں اور پھر ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلا جاؤں اور اس مبارک جامعہ میں جاروب کشی کی خدمت انجام دوں۔ (روزنامہ زمیندار، ۱۵/۱۱/۱۹۱۳ء)

اس مراسلہ کا ذکر حیات شبلی میں نہیں ہے۔ حال ہی میں اسے پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے دریافت کیا ہے۔ اس مراسلہ پر اخبارات میں بحث و مباحثہ بھی ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس تجویز کی حمایت کی، البتہ انہوں نے ایک نئی یونیورسٹی کے بجائے مدرسہ صولیہ مکہ مکرمہ کو ترقی دینے اور یونیورسٹی بنانے کی تجویز پیش کی۔ علامہ شبلی کی اس تجویز کی حمایت میں متعدد مراسلے شائع ہوئے جس میں وقار نواز جنگ اور حاجی محمد اسماعیل کے نام قابل ذکر ہیں۔ البتہ ایک آواز اس کے خلاف بھی بلند ہوئی اور وہ آواز مولانا ظفر علی خاں کی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار میں تین قسطوں میں اس کے خلاف مضمون لکھا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ مسلمانوں کی ترقی علوم و فنون کی تحصیل اور یونیورسٹی کے قیام سے نہیں ہو سکتی اس لئے یہ خیال درست نہیں۔

۱۴۔ مدینہ یونیورسٹی کا نصاب تعلیم

۱۹۱۳ء میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا ظفر علی خاں وغیرہ کی کوششوں سے ترکی حکومت نے مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ کے قیام کی تجویز منظور کی۔ شیخ عبدالعزیز شاولیش اس کے ایک اہم رکن تھے۔ علامہ شبلی مولانا حمید الدین فراہی اور علامہ اقبال کو اس یونیورسٹی کا نصاب تعلیم بنانے کے لئے منتخب کیا گیا اور انہیں تاریخ بھیجے گئے۔ علامہ شبلی اسے ایک قومی مسئلہ خیال کرتے تھے۔ چنانچہ اس نصاب کے سلسلے میں انہوں نے زمیندار میں مراسلہ لکھا تا کہ اس پر مزید بحث و مباحثہ ہو۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس لئے کہ مزید تفصیلات دستیاب نہیں۔ حیات شبلی بھی اس کی تفصیل سے خالی ہے۔

۱۵۔ مولانا عبدالباری کی شہادت

۱۹۱۲ء میں علامہ شبلی نے ماہنامہ الندوہ کی ادارت سے استعفیٰ دیا تو ان کی جگہ مولوی

عبدالکریم صاحب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ انہوں نے فوراً ہی جہاد پر ایک مضمون لکھا جو قابل اعتراض قرار پایا۔ چنانچہ تمام معتمدین ندوہ نے مل کر انہیں معطل کر دیا اور جب معطلی پر ہنگامہ ہوا تو اس کی تمام تر ذمہ داری علامہ شبلی کے سر ڈال دی، اس مسئلہ نے اتنا طول کھینچا کہ بات اخبارات تک پہنچ گئی اور علامہ شبلی پر طرح طرح کے الزامات عائد کئے گئے۔ ان کے جواب میں علامہ شبلی نے کئی مراسلے لکھے۔ یہ مراسلہ بھی اسی سلسلہ کا ہے۔ اس میں انہوں نے مولوی عبدالباری فرنگی محلی کے الزامات کا جائزہ لے کر ثابت کیا ہے کہ خود مولانا عبدالباری اس کارروائی میں شریک تھے اور اب اپنی برأت کا اظہار کر رہے ہیں۔

مولوی عبدالباری صاحب نے اپنے مراسلے میں یہ الزام بھی عائد کیا تھا کہ مولانا شبلی نے دھمکی دے کر اراکین کو اپنا ہم نوا بنایا تھا، علامہ شبلی نے اس کی بھی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ تمام معتمدین نے متفقہ طور پر مولوی عبدالکریم کو معطل کیا تھا۔

۱۶۔ مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی اور مولانا عبداللہ صاحب

یہ مراسلہ مولوی عبداللہ صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء کو مخاطب کر کے لکھا گیا ہے اور وکیل امرت سر میں شائع ہوا ہے۔ یہ مراسلہ بھی مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی ہی کے حوالہ سے ہے، مولوی عبداللہ صاحب نے مسلم گزٹ میں مراسلہ شائع کر کے مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی میں شرکت سے انکار کیا تھا، علامہ شبلی اپنے مراسلہ میں لکھتے ہیں:

”جناب مولوی عبداللہ صاحب!

آپ نے مسلم گزٹ میں اس امر سے برأت ظاہر کی ہے کہ آپ مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی میں شریک مشورہ نہ تھے۔

مولانا!

جو روداد جلسہ انتظامیہ مورخہ ۹ مارچ ۱۹۱۳ء شائع ہوئی ہے، اس

میں ریزولوشن کی یہ عبارت ہے:

”اس جلسہ کے نزدیک مولوی عبدالکریم صاحب کا مضمون

مسئلہ جہاد جو الہندوہ بابت جون ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا، اس کا روائی کا سزاوار نہ تھا، جو معتمد صاحب دارالعلوم نے بہ مشورہ مولوی عبدالحئی صاحب و مولوی ظہور احمد صاحب کی اور یہ جلسہ یہ امر ضروری سمجھتا ہے کہ مولوی عبدالکریم صاحب سے یہ تینوں حضرات تحریری معافی مانگ کر جو نقصانات ان کو ان کی شہرت وغیرہ کے متعلق اس کا روائی سے پہنچے ہیں تلافی کریں۔“

اس تجویز کی تائید مولوی اعجاز علی صاحب نے کی، مولوی محمد نسیم صاحب نے ترمیم کی کہ اس تجویز کا آخری حصہ جو معافی و تلافی کے متعلق ہے، اس کو نکال ڈالا جائے اس کی تائید مولوی عبدالباری صاحب نے کی اور باتفاق آراء ترمیم پاس ہوئی۔

یہ ریزولوشن بہ ترمیم تحریک مقامی پاس ہوا، آپ بھی اس جلسہ میں موجود تھے، کیا جلسہ انتظامیہ کی یہ کارروائی، جس میں نہایت کثرت سے ممبر شریک تھے اور جو خود آپ کے زیر اہتمام شائع کی گئی ہے، غلط سمجھی جائے؟ اور کیا اس میں اتفاق آرا کا لفظ غلط ہے؟ اور مولوی عبدالباری صاحب نے اپنی شہادت میں یہ الفاظ بیان کیے ہیں:

”اس پر مولوی شبلی صاحب نے فرمایا کہ اچھا آپ (مولوی عبدالحئی صاحب) معطلی کا حکم لکھ دیں، مولوی عبدالحئی صاحب نے منظور کیا۔“ کیا یہ الفاظ غلط ہیں؟ (۷ جون ۱۹۱۳ء از وکیل، امرت سر)

اس کے بعد دونوں کے درمیان کیا خط و کتابت ہوئی اس کی تفصیلات دستیاب نہیں

ہیں۔

۱۷۔ مولوی عبدالکریم کی معطلی

علامہ شبلی کا یہ مراسلہ بھی مذکورہ بالا واقعہ سے متعلق ہے اور زمیندار میں شائع ہوا

ہے۔ یہ مراسلہ اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ یہ ابھی حال میں دریافت ہوا ہے۔ مقالات شبلی میں شامل نہیں اور غالباً حیات شبلی کے مصنف کی بھی نظر سے نہیں گذرا، اسے مذکورہ بالا مراسلات کا خلاصہ تصور کرنا چاہئے۔ چونکہ یہ نو دریافت مراسلہ ہے اس لئے مکمل نقل کیا جاتا ہے۔
السلام علیکم۔

میں دس دن سے سخت علیل ہوں اور صاحب فراش، میرے متعلق آج کل جواہرات اور اکاذیب کا طوفان برپا کیا گیا ہے میں اس سے بے خبر نہیں ہوں، لیکن اول تو میری عام عادت ایسے موقعوں پر سکوت کی ہے، ثانیاً سخت بیماری کی وجہ سے میں کچھ نہ لکھ سکا۔ مفصل بعد صحت لکھوں گا۔ اس وقت مختصر اچند امور گزارش ہیں۔

۱۔ میں نے اس وقت تک کوئی تحریر گورنمنٹ کے کسی افسر کو مولوی عبدالکریم صاحب کے متعلق خود نہیں بھیجی، نہ میں اس وقت تک کسی افسر سے اس معاملہ کے پیش آنے کے وقت سے اب تک ملا۔ جو تحریریں گورنمنٹ میں گئی ہیں وہ دفتر نظامت سے گئی ہیں، جو میرے محکمہ سے بالآخر محکمہ ہے۔

۲۔ جس جلسہ میں مولوی عبدالکریم صاحب کا تا جلسہ انتظامیہ معطل ہونا طے ہوا تھا اس میں پانچ حضرات شریک تھے، یعنی جناب مولوی عبدالباری صاحب فرنگی محلی، مولوی ظہور احمد صاحب، مولانا مولوی سید عبدالحی صاحب، منشی احتشام علی صاحب سکریٹری مال اور خود میں۔ اس جلسہ میں جو متفقہ انگریزی یادداشت مرتب ہوئی، مولوی ظہور احمد صاحب نے کی اور بذریعہ دفتر نظامت کے ڈپٹی کمشنر صاحب کے پاس بھیجی گئی، اس پر تینوں سکریٹری کے دستخط تھے یعنی مولانا سید عبدالحی صاحب، منشی احتشام علی صاحب اور خود میرے۔ اردو تحریر میں اضافہ کے متعلق جو مجھ پر اعتراض ہے اس کی بابت بعد کو لکھوں گا، اس وقت یہ عرض ہے کہ میں نے اپنی یاد سے اردو یادداشت میں جو لفظ اضافہ کیا وہ دفتر نظامت میں بھیج دیا گیا تھا اور وہ

ایسا امر نہیں کہ اس پروا قعہ کا کوئی انحصار ہو۔

۳۔ یہ امور کہ مضمون مذکورہ کا مقاصد ندوہ کے خلاف ہے اور اس کی اطلاع ڈپٹی کمشنر صاحب کو دینی چاہئے اور یہ کہ پرچہ (الندوہ) روک دیا جائے اور یہ کہ مولوی عبدالکریم صاحب ایڈیٹری سے معطل کئے جائیں، اس جلسہ کے تمام ارکان مذکورہ بالا کا متفقہ فیصلہ تھا، میں نے کوئی مزید حصہ اس میں نہیں لیا، یہ امر خود ان حضرات سے دریافت کرنا چاہئے، البتہ جب اس جلسہ کے سب ارکان کی یہ رائیں قائم ہو چکیں کہ مضمون، مقاصد ندوہ کے خلاف ہے تو میں نے اس بات پر زور دیا کہ جس طرح مولوی عبدالکریم صاحب کے متعلق یہ سب امور تا جلسہ انتظامیہ طے کئے جاتے ہیں اسی طرح جلسہ انتظامیہ کے منعقد ہونے تک وہ مدرسہ سے بھی معطل رہیں، کیونکہ مدرسہ خاص میری ذمہ داری میں ہے۔

۴۔ ندوۃ العلما کے اکیاون (۵۱) ممبر ہیں، جن میں دو ٹلٹ علماء ہیں، ان کی کثرت آراء اب موصول ہو چکی ہیں۔

جن ارکان نے مضمون مذکورہ کو قابل گرفت خیال کیا اور اس بنا پر مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی تا جلسہ انتظامیہ سے اتفاق کیا ان میں بعض حضرات یہ ہیں۔ جناب حاجی نواب اسحاق خاں صاحب سکرٹری علی گڑھ کالج، جناب حاجی رحیم بخش صاحب پریزیڈنٹ بہاول پور، مولوی حبیب الرحمن صاحب شروانی رئیس علی گڑھ، جناب مولوی نظام الدین صاحب جعفری افسر واعظین مجلس ہدایت الاسلام دہلی، مولوی غلام محمد صاحب فاضل ہوشیار پوری، مولوی قاری عبدالسلام صاحب پانی پتی، امام صاحب جامع مسجد دہلی، حکیم عبدالولی صاحب۔ متعدد اراکین کی رائیں اس کے خلاف بھی ہیں لیکن کثرت آراء اسی طرف ہے۔

۵۔ اس امر پر کہ اصل مضمون قابل گرفت ہے یا نہیں میں بعد

صحت تفصیل سے لکھوں گا۔ اس وقت صرف اس قدر گزارش ہے کہ مضمون مذکورہ دفعہ دس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کوئی مسلمان کسی کافر کی حکومت میں نہیں رہ سکتا اگر رہے گا تو گنہگار ہوگا۔

شبلی نعمانی

(زمیندار لاہور، ۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ء)

۱۸۔ اوقاف اسلامی

وقف علی الاولاد کی تحریک کے زمانہ میں علامہ شبلی کے دل میں عام اوقاف اسلامی کے تحفظ کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ وہ اس کے لئے بھی تحریک چلانا چاہتے تھے۔ اسی سلسلہ میں یہ مراسلہ لکھا تھا۔ یہ مراسلہ کہاں شائع ہوا اس کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اسے مقالات شبلی میں نقل کیا ہے اور حیات شبلی میں اس پر اظہار خیال بھی کیا ہے۔

۱۹۔ ایک اہم مراسلہ (دارالمصنفین)

۱۱ فروری ۱۹۱۴ء کو دارالمصنفین کی تجویز پر مشتمل یہ مراسلہ الہلال میں شائع ہوا ہے۔

مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ:

”خدا کا شکر ہے کہ ملک میں تصنیف و تالیف کا مذاق پھیلتا جاتا ہے اور قابل قدر رباب قلم پیدا ہوتے جاتے ہیں، لیکن بائیں ہمد اس گروہ میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے، جن کو مصنف کے بجائے مضمون نگار یا انشاپرداز کہنا زیادہ موزوں ہوگا، کیوں کہ ان کی مستقل تصنیفیں نہیں ہیں بلکہ معمولی رسالے یا مضامین ہیں۔“

اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کو اعلیٰ درجہ کی تصنیف کی قابلیت نہیں، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی تصنیف کے لیے جو سامان درکار ہے وہ مہیا نہیں ہے، ان میں سے اکثر کے پاس کتابوں کا ذخیرہ نہیں، جو انتخاب اور استنباط اور اقتباس کے کام آئے، اتفاق سے اگر کوئی مقامی کتب خانہ موجود ہے تو

دلجمعی کے اسباب نہیں کہ اطمینان سے چند روز وہاں رہ کر کتابوں کا مطالعہ اور اس سے استفادہ اور نقل و انتخاب کر سکیں، ان باتوں کے ساتھ کوئی علمی مجمع بھی نہیں کہ ایک دوسرے سے مشورہ اور مبادلہ خیالات ہو سکے۔

ان مشکلات کے حل اور تصنیف و تالیف کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ایک وسیع ”دارالتصنیف“ امور ذیل کے موافق قائم کیا جائے۔“
(الہلال ۱۱ فروری ۱۹۱۴ء)

علامہ شبلی دارالمصنفین ندوہ میں قائم کرنا چاہتے تھے۔ مگر اسی زمانہ میں وہ ندوہ سے مستعفی ہوئے اور اعظم گڑھ آئے اور دارالمصنفین اعظم گڑھ میں قائم کیا۔ اب دارالمصنفین کے قیام پر صدی گزر چکی ہے۔ سو سال میں اس ادارہ نے بڑے عظیم الشان علمی و تحقیقی اور تصنیفی کارنامے انجام دئے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے نہ صرف دوسو سے زائد بلند پایہ کتابیں شائع کیں بلکہ اس نے متعدد اہل قلم اور ارباب کمال پیدا کئے اور اب اس کی تاریخ پر کئی ضخیم کتابیں سپرد قلم کا جا چکی ہیں۔

۲۰۔ ایک مذہبی مدرسہ اعظم کی عمارت کے لئے.....

علامہ شبلی نے یہ مراسلہ ماہنامہ الندوہ میں لکھا۔ اس میں انہوں نے دارالعلوم ندوہ کی عمارت کی تعمیر کے لئے لوگوں کو راغب کیا ہے اور لکھا ہے کہ ”تمام ہندوستان میں ایک بھی ایسا خالص دینی و مذہبی مدرسہ نہیں جو بلحاظ جامعیت و وسعت کے مدرسہ اعظم کہلانے کا مستحق ہو۔“ پھر انہوں نے ان ضروریات کی تفصیل لکھی ہے جس کو پورا کر کے مدرسہ اعظم کی تعمیر کی جاسکتی ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ:

”چونکہ یہ عمارت ایک عظیم الشان عمارت ہوگی جس کا تخمینہ پچاس ہزار سے کم نہیں ہو سکتا، اس لئے ندوہ کی طرف سے ہم چند ارکان نے ارادہ کیا ہے کہ مشہور مقامات میں دورہ کر کے اس رقم کو فراہم کریں۔ امید ہے کہ بزرگان قوم ہماری اور اپنی شرم رکھیں گے اور ایک خالص مذہبی کام کے انجام

دینے میں ہم کو مایوس نہ کریں گے۔‘ (مقالات شبلی ج ۸ ص ۹۶)

۲۱۔ اسٹرائک کا سبب کون تھا

ندوہ میں طلبہ کے ساتھ بعض زیادتیاں ہوئیں جن کے سبب طلبہ نے ۷ مارچ ۱۹۱۴ء کو اسٹرائک کر دی۔ ذمہ داران ندوہ نے اس اسٹرائک کی ذمہ داری بھی علامہ شبلی کے سر ڈال دی، چنانچہ علامہ شبلی نے ۶ اپریل ۱۹۱۴ء کو ہمدرد دہلی میں ایک مراسلہ ”اسٹرائک کا سبب کون تھا“ لکھ کر اسٹرائک کے اسباب بتائے۔ اور قدرے تفصیل سے ان اسباب کی وضاحت کی جن کے سبب اسٹرائک ہوئی۔ یہ تاریخی اسٹرائک کئی ماہ تک جاری رہی۔ اس کے روح رواں مولانا مسعود علی ندوی [۱۸۸۹-۱۹۶۷ء] تھے۔ اسٹرائک ختم کرانے کے لئے اس وقت کے عمائدین نے کوشش کی تب جا کر یہ ختم ہوئی۔ اس کی تفصیل حیات شبلی میں موجود ہے۔

۲۲۔ اصلاح ندوہ اور ہمدرد

مولانا محمد علی جوہر ایڈیٹر رسالہ ہمدرد دہلی نے ۲۴ اپریل ۱۹۱۴ء کے ہمدرد میں اصلاح ندوہ کے سلسلے میں چند مشورے دئے اور لکھا کہ ندوہ میں جو خرابیاں ہیں ان کا ذکر فرداً فرداً تمام اراکین ندوہ سے کرنا چاہئے۔ اگر اس سے کام نہ بنے تو پھر جوش و غیرت دلائی جائے کہ یہ قومی ادارہ ہے اسے برباد ہونے سے بچانا چاہئے۔ علامہ شبلی نے اس کے جواب میں یکم مئی ۱۹۱۴ء کو ہمدرد ہی میں ایک مراسلہ لکھا اور واضح کیا کہ پہلے طریقہ کے مطابق اصلاح ندوہ کی کئی بار کوشش ہو چکی ہے یہاں تک کہ

میں نے بار بار فرداً فرداً اور اجتماعی طریقہ سے اس کی طرف توجہ دلائی، دو سال ہوئے کہ میں نے ایک مطبوعہ خط تمام ارکان کی خدمت میں بھیجا کہ موجودہ خرابیاں اس وجہ سے ہیں کہ ندوہ میں دو مختلف الخیال اور مختلف المذاق قسم کے ممبر ہیں، اس لئے دونوں کی کشمکش کی وجہ سے کسی امر کی اصلاح نہیں ہو سکتی اس بنا پر یہ مناسب ہوگا کہ یورپ کے قاعدہ کے

موافق ایک مدت معین تک ایک مذاق کے تمام ممبر کام سے دست بردار ہو جائیں اور تنہا ایک فریق کو کام کرنے دیا جائے اور سب سے پہلے میں خود اور میرے ہم خیال اس کے موافق دست کش ہونے پر آمادہ ہیں لیکن یہ تجویز جلسہ انتظامیہ میں نامنظور کی گئی۔‘ (مقالات شبلی ج ۸ ص ۱۳۳-۱۳۴)

پھر یہ واضح کیا کہ اب مسلمانوں کی عام کانفرنس کے سوا اس کا کوئی دوسرا علاج باقی نہیں رہا۔

۲۳۔ جلسہ دہلی کے متعلق ایک عام غلط فہمی کی تردید

ندوہ کے آپسی اختلافات میں جب شدت پیدا ہو گئی تو اس کو حل کرنے کے لئے دہلی میں ایک اجلاس ہونا طے پایا اس کے روح رواں حکیم اجمل خاں تھے۔ اس کے متعلق لوگوں میں عجیب عجیب قیاس آرائیاں کی گئیں ایسی ہی ایک غلط فہمی کے ازالہ کے لئے علامہ شبلی نے ۲۰ مئی ۱۹۱۴ء کے زمیندار میں ایک مراسلہ لکھا جس میں لکھا کہ

یہ خیال غلطی سے عام طور پر پھیل گیا ہے کہ دہلی میں ندوہ کی اصلاحی تجویز کے متعلق جو جلسہ ہونے والا ہے، وہ موجودہ کارکن اشخاص کی مخالفت اور ان کے ساتھ معرکہ آرائی کا جلسہ ہے، اس غلط خیال نے تمام پبلک میں ایک اشتعال آمیز (مخالف یا موافق) جوش پیدا کر دیا ہے، تو میں جب ابتدائی ترقی کے دور میں ہوتی ہیں تو ان کا مذاق طبع ہر بات میں اشتعال انگیز پہلو کو ڈھونڈھتا ہے اور اس سے متاثر ہو کر اصل حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ندوہ کے چند امور مسلمہ فریقین ہیں، یہ امر کہ ندوہ میں کچھ خرابیاں ہیں، دونوں کو تسلیم ہے، یہ امر ان خرابیوں یا اصل قانون ندوہ میں اصلاح کی حاجت ہے، دونوں فریق کو تسلیم ہے، گفتگو صرف یہ ہے کہ یہ خرابیاں کس نے پیدا کیں؟ اور اب ان کی اصلاح کا کیا طریقہ ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ ہر فریق دوسرے فریق کو خرابیوں کا ذمہ دار بتاتا ہے اور اگرچہ اس

میں شک نہیں کہ اگر کوئی آزاد کمیشن بیٹھتا تو یہ مسئلہ صاف ہو جاتا، لیکن بہر حال ایسا کرنے میں مخالفت اور جوش کا زیادہ احتمال ہے، اس لیے سر دست اسی نقطہ کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ خرابیاں کیا ہیں؟ اور اصلاح کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟ (مقالات شبلی ج ۸ ص ۱۳۶-۱۳۷)

یہ مراسلہ قدرے طویل ہے، اس کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا ہے:

ارکان ندوہ کے علاوہ جو لوگ اس مسئلہ کو قوم میں لانے کے مخالف ہیں، صرف دو قسم کے لوگ ہیں، یا وہ ہیں جو آج ۲۲ برس سے ندوہ کے مخالف اور اس کے وجود کے دشمن ہیں، ان کو اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ ندوہ کل کا تباہ ہوتا ہوا آج تباہ ہو جائے، یا وہ لوگ ہیں جو خود کسی انسٹیٹیوشن پر اسی طرح خود مختار انداز قابض ہیں اور ڈرتے ہیں کہ اس آگ کے شعلے پھیلنے پھیلنے ان کے گھر تک نہ پہنچ جائیں۔ (ایضاً)

۲۴۔ ترکوں کی اعانت

یہ مراسلہ دراصل علامہ شبلی کے اپنے ہی ایک فتویٰ کے سلسلہ میں ہے۔ جنگ بلقان کے زمانہ میں بقرعید آئی تو علامہ شبلی کو خیال ہوا کہ ہندوستان کے مسلمان قربانی کا پیسہ اگر ان لوگوں تک پہنچا دیں جو اس وقت حقیقی قربانی پیش کر رہے ہیں تو یہ ترکی کا ایک بڑا تعاون ہوگا۔ چنانچہ علامہ شبلی نے اس سلسلہ میں ایک فتویٰ تیار کیا جس سے علمائے فرنگی محل نے بھی اتفاق کیا لیکن بعض لوگوں نے اس سے اختلاف بھی ظاہر کیا۔ ان کے شاگرد مولانا ظفر علی خاں نے بھی اس پر خدشہ ظاہر کیا۔ اسی شبہ کو دور کرنے کے لئے علامہ شبلی نے درج ذیل مراسلہ لکھا اور اخبارات میں شائع کرایا۔:

”جناب من!

بعض صاحبوں کا خیال ہے کہ ترکوں کی ہمدردی میں اگر قربانی کے بہ جائے قیمت دی گئی تو اس سے احتمال ہوگا کہ قربانی خود غیر ضروری

ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں، شریعت میں فرائض کے درجات میں بھی ترتیب ہے اور وقتی ضرورتوں کا خیال رکھا گیا ہے، غزوہ خندق میں جہاد میں مصروف ہونے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز عصر قضا ہوئی تو کیا یہ حجت ہو سکتی ہے کہ نماز کا قضا کرنا جائز ہے۔؟

ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے، اس لیے اس خاص موقع اور ضرورت کے وقت اگر یہ فرض مقدم رکھا گیا تو اس سے آئندہ کے لیے کیا حجت ہو سکتی ہے؟

قربانی شعارِ اسلام ہے، مسلمان اس کو نہیں چھوڑ سکتے، نہ کوئی قوم ان کو اس پر مجبور کر سکتی ہے، نہ وہ اس کے مقابلہ میں دنیا کی کسی قوم کی پروا کر سکتے ہیں۔“ (حیات شبلی ص ۶۳)

اب تک علامہ شبلی کے کل ۲۴ مذکورہ مراسلات دستیاب ہوئے ہیں، چونکہ ان کے عہد کے اخبارات بالخصوص ہمدرد دہلی، زمیندار لاہور اور مسلم گزٹ لکھنؤ کی مکمل فائلیں دستیاب نہیں ہیں اس لئے یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اب مزید مراسلات دستیاب نہیں ہوں گے، بہر حال جو مراسلات دستیاب ہیں ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبلی ہمہ وقت ملت کے لئے فکر مند رہتے تھے اور اس کو زوال کے بھنور سے نکالنے اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں کرتے رہتے تھے اور یہ سب وہ تنہا کرنے کے بھی مدعی نہ تھے بلکہ ان کی خواہش تھی وہ تمام لوگ جو ملت کا درد رکھتے ہیں، اس میں شامل ہوں اور تمام ملی ورفائی کاموں کو مشترکہ اور متفقہ طور پر انجام دیا جائے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو علامہ شبلی اپنے معاصرین میں سب سے ممتاز اور یگانہ شخص تھے۔

ظفر حسن ایک اور تصانیف شبلی کے انگریزی و ترکی تراجم

عالم اسلام میں شبلی شناسی کے عنوان سے راقم نے ۲۰۰۸ء میں ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو شبلی کالج میگزین کے ”شبلی نمبر“ میں شائع ہوا اور اب میری کتاب ”متعلقات شبلی“ میں شامل ہے۔ اس میں تصانیف شبلی کے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہونے والے تراجم کی تفصیل ہے۔ اس میں ترکی تراجم کی تفصیل اس طرح ہے:

”علامہ شبلی پونے تین ماہ قسطنطنیہ میں رہے، پھر وہاں سے شام کا رخ کیا اور فلسطین و مصر ہوتے ہوئے ہندوستان آئے، اس کے بعد ترکوں سے ان کے کیا روابط رہے اس کی کوئی تفصیل ان کی سوانح یا مکاتیب میں نہیں ملتی۔ ترکوں نے علامہ شبلی کو یاد رکھا یا نہیں؟ وہاں ان پر کوئی تحقیقی کام ترکی یا اردو زبان میں ہوا یا نہیں؟ اس کے بارے میں بھی معلومات دستیاب نہیں، البتہ ایک عرصہ بعد ۱۹۲۶ء میں محمد عمر رضا کحالہ آفندی نے علامہ شبلی کی شہرہ آفاق تصنیف الفاروق کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا اور اس محبت کا حق ادا کیا جو علامہ شبلی کو خاص طور پر ترکوں سے تھی۔ یہ ترجمہ آمدی مطبع سی استنبول سے ۱۹۲۶ء مطابق ۱۳۴۵ھ میں ”حضرت عمرؓ“ کے نام سے شائع ہوا اور اس قدر مقبول ہوا کہ محض دو سال بعد ۱۹۲۸ء میں کون طوغدی مطبع استنبول سے دوبارہ شائع ہوا۔

محمد عمر رضا آفندی نے علامہ شبلی کی سیرۃ النبی کو بھی ترکی جامہ پہنایا

جسے بڑے اہتمام سے کتب خانہ علمیہ قسطنطنیہ نے ۱۹۲۸ء میں شائع کیا۔ یہ دونوں ترجمے کتب خانہ دارالمصنفین میں موجود ہیں، لیکن ترکی زبان سے ناواقفیت کے سبب یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ ترجمے کس معیار کے ہیں اور مترجم کی اردو زبان پر کس درجہ دست رس تھی، باوجود تلاش بسیار کے عمر رضا آفندی کے حالات بھی معلوم نہ ہو سکے۔ (متعلقات شبلی ص ۱۶۵)

تقریباً ایک سال پہلے فیس بک پر جناب راشد اشرف صاحب نے ظفر حسن ایکب کی آپ بیتی کے چند صفحات نقل کئے تھے، اتفاق سے ان صفحات میں علامہ شبلی کی کتاب الفاروق اور سیرۃ النبی کے ترکی ترجمہ کا ذکر تھا میں نے راشد اشرف صاحب سے کتاب فراہم کرنے کی خواہش کی، وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے کتاب فراہم نہ کر سکے، البتہ ایک اور علم دوست جناب محمد حامد سراج صاحب میانوالی نے اس کتاب کی فراہمی کی ذمہ داری اپنے سر لے لی اور چند ماہ بعد کتاب کا محقق ایڈیشن مجھے بھجوایا، اس علم دوستی کے لئے میں ان کا بے حد ممنون و شکر گزار ہوں۔

ظفر حسن ایکب کی آپ بیتی ”خاطرات“ کا محقق ایڈیشن ۱۹۹۰ء میں سنگ میل پبلی کیشن لاہور سے شائع ہوا ہے اس کے مرتب استانبول یونیورسٹی ادبیات فیکلٹی کے سابق استاذ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار مرحوم ہیں، انہوں نے خاطرات کی ترتیب و تدوین کا کام مصنف ظفر حسن ایکب کے تعاون سے انجام دیا ہے، اس لئے یہ کتاب کا سب سے معتبر نسخہ ہے۔

ظفر حسن ایکب کرنال کے رہنے والے تھے، گورنمنٹ کالج لاہور میں جس زمانہ میں بی اے کے طالب علم تھے طلبہ کی ایک جماعت نے قرآن پاک پر حلف لے کر آزادی کی جدوجہد زندگی کا مقصد قرار دیا، انہی طلبہ میں ایک ظفر حسن ایکب بھی تھے، چنانچہ ان لوگوں نے تعلیم ادھوری چھوڑ کر آزادی وطن کے لئے جدوجہد کی، اس کے نتیجے میں انہیں افغانستان، روس اور ترکی میں جلاوطنی کی زندگی گزارنی پڑی، ان کے اصل رہنما مولانا عبید اللہ سندھی تھے، جن کے مولانا شبلی سے بھی گہرے مراسم تھے۔

ترکی کے زمانہ قیام میں ظفر حسن ایکب نے محمد عمر رضا دوغزل کے مشورہ سے اردو کی چند مشہور کتابوں کے ترجمہ کا منصوبہ بنایا جس میں سرفہرست علامہ شبلی کی تصانیف الفاروق اور

سیرۃ النبی تھیں، مترجم کا خیال تھا کہ ان ترجموں سے مالی حالت بھی بہتر ہوگی اور علمی حیثیت سے ترکی زبان میں اچھی کتابوں کا اضافہ ہوگا، لیکن اس وقت ظفر حسن ایک ترکی زبان سے نا آشنا تھے، اس لئے یہ طے پایا کہ ظفر حسن ایک ان کتابوں کو اردو سے انگریزی میں منتقل کر دیں اور عمر رضا دغزل بک انہیں انگریزی سے ترکی جامہ پہنائیں، چنانچہ ظفر حسن ایک نے سب سے پہلے الفاروق کا انگریزی میں ترجمہ کیا، اس کی تفصیل انہوں نے آپ بیتی میں اس طرح پیش کی ہے:

”میں نے عمر رضا دغزل بک سے مولانا شبلی مرحوم کی تصانیف کا ترجمہ کر کے ترکی میں چھپوانے کے امکانات پر گفتگو کی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ میں ان کتابوں کا ترجمہ اردو سے انگریزی میں کروں اور عمر رضا دغزل بک اس انگریزی مسودے کا ترکی میں ترجمہ کریں، (میں اس زمانہ میں ترکی نہ جانتا تھا) اور یہ ترکی ترجمہ کتب خانہ آثار علمیہ کی طرف سے استانبول میں چھاپا جائے، اس سے میرے گزارے کا بھی انتظام ہو جائے گا۔

میں نے بھائی صاحب کو کرنال لکھ کر ان سے الفاروق اور سیرۃ النبی کی چار جلدیں، عبداللہ منہاس مرحوم کی تصنیف کردہ پیام امین جیسی مذہبی کتابیں بھیجنے کی درخواست کی، کتابیں آنے پر میں نے سب سے پہلے الفاروق کا انگریزی ترجمہ کیا، عمر رضا دغزل بک نے اس ترجمہ سے کتاب کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا اور اس کو ۱۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو چھپنے کے لئے کتب خانہ آثار علمیہ کو دیدیا۔ یہ کتاب ترکی میں ”حضرت عمرؓ“ کے عنوان سے چھپی اور بہت مقبول عام ہوئی۔

میں نے اس ترجمے کے معاوضے میں پیسہ لینا نہ چاہا اور ترکی میں اپنی سب سے پہلی علمی کوشش کو کتب خانہ آثار علمیہ کو بطور ہدیہ پیش کر دیا۔ اس کتاب کے فروخت سے کتب خانہ کے مالک اشرف ادیب بک کو یقین ہو گیا کہ ایسے ترجموں سے اس کو کافی نفع ہوگا۔“

(خاطرات ص ۳۱۷-۳۱۸)

ظفر حسن ایک نے الفاروق کے بعد سیرۃ النبی کے ترجمے کا آغاز کیا، جس میں انہیں ایک سال سے زائد کا عرصہ لگا، اس کے لئے انہوں نے بعض صعوبتیں بھی برداشت کیں، اس کی تفصیل انہی کے قلم سے ملاحظہ ہو:

”اس کے بعد سیرۃ النبی کی تین جلدوں کا ترجمہ کرنے میں مجھے تقریباً ایک سال لگا، جس سے مجھے اتنی آمدنی ہوتی رہی کہ نہ صرف میں اپنا گزارہ کر سکا بلکہ بعض ہندوستانی مسلمان غریب مہاجروں کی بھی مدد کرتا رہا۔

سیرۃ النبی کی تین جلدوں کا ترکی ترجمہ ”عصر سعادت“ کے نام سے اور چار جلدوں کی صورت میں یکم دسمبر ۱۹۲۸ء میں چھپ کر شائع ہوا، ترکی میں اس کتاب کو سب علماء نے بہت ہی پسند کیا اور اس کے متعلق اخبارات میں بہت سے مقالے لکھے۔ یہ ساری کتابیں پرانے ترکی حروف (عربی حروف) میں چھپی تھیں، صرف ”عصر سعادت“ سیرۃ النبی کی آخری جلد پرانے ترکی حروف (یعنی عربی رسم الخط) میں چھپوانے میں ذرا مشکلات پیش آئیں، کیونکہ اس زمانے میں ترکی میں عربی حروف کی بجائے رومن حروف کے استعمال کے بارے میں قانون بن گیا تھا اور نومبر ۱۹۲۸ء کے مہینے کے بعد کوئی کتاب یا اخبار عربی حروف میں نہ چھپ سکتا تھا۔“

(خاطرات ص ۳۲۵-۳۲۶)

ظفر حسن ایک نے لکھا ہے کہ ترکی کے نئے قانون کے مطابق یہ ترجمہ نہیں کیا جاسکتا تھا اس لئے کہ انہوں نے ترک شہریت حاصل کر کے وہاں کی فوج میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

”میں ترکی رعایا بننے کے بعد یکم اگست ۱۹۲۸ء کو فوج میں داخل ہو گیا تھا اور چھاؤنی یعنی فوجی بارک میں رہنے لگا تھا، جہاں اس قسم کا ترجمہ وغیرہ کرنا ناممکن تھا، اس لئے میں مختلف بہانے سے باہر جا کر ایک دوست

کے گھر میں کتاب کا ترجمہ کیا کرتا تھا، خدا خدا کر کے میں نے یہ ترجمہ ستمبر کے آخر تک ختم کیا اور عمر رضا دوغزل بک نے ترکی ترجمہ اکتوبر میں پورا کیا اور کتاب کا آخری حصہ نومبر کے شروع میں پریس میں دیدیا گیا جس سے بروقت مقررہ عربی حرفوں میں چھپ کر تیار ہو گیا۔“ (خاطرات ص ۳۲۶)

الفاروق اور سیرۃ النبی کے ترکی ترجمہ کی یہ داستان ظفر حسن ایک کی آپ بیتی ”خاطرات“ کے علاوہ کہیں دستیاب نہیں، البتہ عمر رضا دوغزل بک کے ترجمے کتب خانہ دارالمصنفین میں محفوظ ہیں۔ مگر ان سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ ترجمے ظفر حسن ایک نے کئے تھے اور عمر رضا دوغزل نے انہیں ترکی جامہ پہنایا۔ بہر حال ظفر حسن ایک کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے جس سے اہل علم علی العموم واقف نہیں۔

عمر رضا دوغزل بک کے ترکی ترجمے راقم کی نظر سے گزرے ہیں، ان کے سرورق یادیاچے میں اس کی کہیں صراحت نہیں کہ یہ ترجمے انگریزی سے کئے گئے ہیں، اگر یہ وضاحت ہوتی تو انگریزی مترجم کا بھی ذکر آتا۔ افسوس کہ ظفر حسن ایک نے بھی خاطرات میں اپنے انگریزی ترجموں کے محفوظ ہونے یا نہ ہونے کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے حالانکہ یہ ترجمے بھی اولیت کا درجہ رکھتے ہیں، اس لئے کہ الفاروق کے انگریزی کے جو ترجمے مولانا ظفر علی خاں اور شیخ محمد سلیم کے قلم سے شائع ہوئے وہ سب ظفر حسن ایک کے بعد کے کئے ہوئے ہیں۔ اسی طرح سیرۃ النبی کے بھی انگریزی تراجم ظفر حسن ایک کے بعد کے ہیں۔

ظفر حسن ایک کے تراجم کا کہیں سراغ نہیں ملتا، ممکن ہے وہ استانبول کے کسی کتب خانے میں محفوظ ہوں جہاں ظفر حسن ایک نے اپنی زندگی گزاری یا پھر عمر رضا دوغزل بک کے ذاتی اثاثہ میں محفوظ ہوں۔ ترک اسکا لرا اگر اس کی طرف توجہ دیں تو شاید وہ کہیں دستیاب ہو جائیں جو بلاشبہ ذخیرہ شہلیات میں گراں قدر اضافہ ہوں گے۔

علامہ شبلی اور لسان الصدق

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد [۱۸۸۸-۱۹۵۸ء] کے حیرت انگیز کارناموں میں ماہنامہ لسان الصدق کی ادارت بھی شامل ہے۔ یہ رسالہ انہوں نے پندرہ/ سولہ سال کی عمر میں کلکتہ سے جاری کیا تھا۔ اس کا پہلا شمارہ نومبر ۱۹۰۳ء میں نکلا اور آخری شمارہ جو دستیاب ہے وہ مئی ۱۹۰۵ء کا ہے۔ جس سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ رسالے کا آخری شمارہ ہے، اس لئے قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ماہنامہ لسان الصدق کب تک جاری رہا، ممکن ہے اس کے کچھ اور شمارے نکلے ہوں۔

لسان الصدق کے پہلے شمارے میں سرورق پر مولانا آزاد نے اس کے درج ذیل مقاصد لکھے ہیں:

۱۔ سوشل ریفارم یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنا۔

۲۔ ترقی اردو یعنی اردو زبان کے علمی لٹریچر کے دائرہ کو وسیع کرنا۔

۳۔ علمی مذاق کی اشاعت بالخصوص بنگالہ میں۔

۴۔ تنقید یعنی اردو تصانیف پر منصفانہ ریویو کرنا۔

(ماہنامہ لسان الصدق کلکتہ نومبر ۱۹۰۳ء ص ۱، سرورق، دسنوی ص ۹)

پھر مولانا آزاد نے مذکورہ مقاصد کی تشریح کی ہے۔

آٹھ ماہ بعد [اگست، ستمبر ۱۹۰۴ء میں] مذکورہ مقاصد میں دو اور مقاصد اصلاح

خیالات اور مذہبی مضامین کا مولانا ابوالکلام آزاد نے اضافہ کیا اور رسالہ کی ترتیب حسب ذیل قرار

دی:

۱۔ انیسویں صدی کے کسی مشرقی فاضل کی تصویر اور حالات

۲۔ ایک مذہبی مضمون

۳۔ علمی، تاریخی، اخلاقی اور سائنٹفک مضامین

۴۔ انتقاد

۵۔ کسی عمدہ کتاب کا مسلسل ترجمہ یا کوئی مفید علمی تصنیف۔ (ایضاً اگست ستمبر ۱۹۰۴ء

ص ۱۶)

ان اہم مقاصد کے علاوہ ایک اور مقصد جو سر آغاز ہے اور سرورق ہی پر درج ہے۔

خاص طور پر قابل ذکر ہے:

”الصدق ینجک والکذب یرہک لسان الصدق“

کا دستور العمل ہے۔ اس کا فرض ہے کہ یہ قوم کو کذب سے بچائے اور راستی پر

لائے۔ جب اس کا فرض منصبی صرف حق گوئی قرار دیا گیا تو اس کی امید قوم

کو اس سے نہیں رکھنی چاہئے کہ یہ انہیں ایسے ترانے سنائے گا جو نہایت

شیریں معلوم ہوں گے۔ سچی بات ہمیشہ کڑوی معلوم ہوتی ہے، پھر سچائی کی

زبان کیونکر شیریں معلوم ہوگی؟ یہ ہمیشہ تم کو کڑوی کیلی باتیں سنائے گا جو

اگرچہ تمہیں ناگوار معلوم ہوں گی لیکن اس زمانہ کو دور نہ سمجھو جب کہ صدق

کا شہنی ہونا اور کذب کا مہلک ہونا تم پر ظاہر ہو جائے گا۔“

(ماہنامہ لسان الصدق نومبر ۱۹۰۳ء ص ۱)

لسان الصدق کے جو شمارے دستیاب ہیں ان کو اولاً جناب عبدالقوی دسنوی نے یکجا

مرتب کر کے مکتبہ جامعہ دہلی سے اکتوبر ۱۹۸۸ء میں شائع کیا۔ یہ مجموعہ کتابت شدہ ہے۔ پھر

جناب ابوسلمان شاہجہاں پوری [پ: ۳۰ جنوری ۱۹۴۰ء] نے اس کے دستیاب شماروں کا عکسی

ایڈیشن ۱۹۹۶ء میں مولانا آزاد سرچ انسٹی ٹیوٹ کراچی سے گراں قدر مقدمہ کے ساتھ شائع

کیا۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے مذکورہ بالا مقاصد کا بہر حال خیال رکھا

اور ان کی تکمیل کی کوشش کی، البتہ عکسی ایڈیشن میں ایک اسٹیپو کے سوا کسی شخص کی تصویر دکھائی نہیں

دیتی، گویا تصویریں شائع نہیں ہو سکیں۔

ماہنامہ لسان الصدق نے علمی و اصلاحی مضامین، تبصروں اور خبروں کی وجہ سے جلد ہی مقبولیت حاصل کر لی۔ اشاعت کے چند ماہ بعد معاصر رسائل اور بعض اہل قلم نے لسان الصدق کی اہمیت اور افادیت کا عمدہ پیرایہ میں اعتراف کیا۔ ان میں مخزن لاہور [ایڈیٹر شیخ عبدالقادر] عین الاخبار مراد آباد، دلچسپ کلکتہ، ایڈورڈ گزٹ شاہ جہاں پور، نظام الملک مراد آباد وغیرہ کے اعترافات خود لسان الصدق اپریل ۱۹۰۴ء کے صفحات [۲۱-۲۳] میں درج ہیں۔ محض پندرہ سال کی عمر میں مولانا آزادی کی یہ مدیرانہ صلاحیت اور رسالے کے مقاصد کا پاس و لحاظ ان کی عبقریت کا ایک ثبوت ہے۔

مولانا آزادی لسان الصدق کے اجراء سے پہلے کم عمری ہی میں علامہ شبلی سے واقف ہو چکے تھے اور خط و کتابت کا سلسلہ بھی قائم ہو چکا تھا۔ اس کا آغاز ۱۹۰۱ء میں ہوا۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں انہیں جدید علوم کی کتابوں کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا تو انہوں نے علامہ شبلی سے رجوع کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

”اب مصر و شام کی کتابوں کا شوق ہوا۔ مولانا شبلی کو ایک خط لکھا اور ان سے دریافت کیا کہ علوم جدیدہ کے عربی تراجم کون سے ہیں اور کہاں کہاں سے ملیں گے؟ یہ پہلا خط ہے جو میں نے مولانا [شبلی] کو لکھا۔ انہوں نے دوسطروں میں یہ جواب دیا کہ مصر و بیروت سے خط و کتابت کیجئے۔“

(آزادی کی کہانی آزادی کی زبانی ص ۳۵)

مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ شبلی کے یہ خطوط ان کے مجموعہ ہائے خطوط میں شامل نہیں ہیں۔ مولانا آزاد کے ابتدائی زمانہ کے جو خطوط شائع ہوئے ہیں، ان میں بھی وہ خطوط شامل نہیں۔

مکاتیب شبلی میں علامہ شبلی کے ۴۰ خطوط مولانا ابوالکلام آزاد کے نام شامل ہیں۔ اس میں پہلا خط ۲۱ اکتوبر ۱۹۰۵ء کا ہے اور یہ ماہنامہ الندوہ کی ادارت سے متعلق ہے۔ یہ زمانہ مولانا آزاد کی الندوہ سے وابستگی کا زمانہ ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا آزاد سے علامہ شبلی کی خط و کتابت کا آغاز گویا ۱۹۰۵ء میں ہوا، لیکن یہ درست نہیں۔ جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے مولانا ابوالکلام

آزاد نے خود ۱۹۰۱ء میں خط و کتابت کا سلسلہ قائم ہونے کا ذکر کیا ہے۔ (آزاد کی کہانی ص ۳۵) لیکن اس عرصہ کے خطوط دستیاب نہیں۔ البتہ لسان الصدق مئی ۱۹۰۴ء کے شمارے میں شبلی کا ایک خط ۲۲ مارچ ۱۹۰۳ء کا درج ہے۔ اس کی بنیاد پر آزاد کی شبلی سے معلوم خط و کتابت کا سال النہودہ کی وابستگی سے تین سال پہلے ۱۹۰۳ء قرار پاتا ہے۔

ماہنامہ لسان الصدق کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ شبلی و آزاد کے تعلقات لسان الصدق کی اشاعت کے زمانہ میں بڑے گہرے ہو گئے تھے۔ اس کے صفحات میں مولانا ابوالکلام آزاد نے علامہ شبلی کا جس والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے، وہ علامہ شبلی سے ان کی گہری عقیدت اور دلی شیفگی کا پتہ دیتا ہے۔ علامہ شبلی نے بھی ماہنامہ لسان الصدق سے پوری دلچسپی لی، اس کی سرپرستی قبول کی، انجمن ترقی اردو کی رپورٹیں، مراسلے اور اطلاعات اشاعت کے لئے بھیجیں، یہاں تک کہ بقول مولانا ابوالکلام آزاد:

”انجمن ترقی اردو نے اس کی (لسان الصدق) دلچسپی دیکھ کر اسے اپنا آرگن قرار دیدیا تھا اور مولانا (شبلی) مرحوم انجمن کے متعلق جس قدر مفید و دلچسپ باتیں ہوتی تھیں انہیں سب سے پہلے اس میں اندراج کے لئے بھیج دیتے تھے۔ اور تمام ممبران انجمن کے نام ایک اطلاع شائع کر دی تھی کہ اس پرچے کو ضرور منگوائیں، اس کی وجہ سے ایک بڑی تعداد متعلقین انجمن کی اس کی خریدار ہو گئی تھی۔“ (آزاد کی کہانی ص ۳۰۴)

گویا لسان الصدق انجمن ترقی اردو کا پہلا ترجمان تھا۔

ماہنامہ لسان الصدق کلکتہ کے کل ۱۳ شمارے دستیاب ہیں۔ اور تقریباً ہر شمارہ میں علامہ شبلی کا ذکر براہ راست یا بالواسطہ کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ ذیل میں علی الترتیب ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ نومبر ۱۹۰۳ء (جلد نمبر ۱)

یہ لسان الصدق کا پہلا شمارہ ہے۔ اس میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اولاً ماہنامہ لسان

الصدق کے مقاصد بیان کئے ہیں اور مقصد اول یعنی سوشل ریفارم پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس میں انہوں نے ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوۃ العلماء کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ”بڑی مسرت کی بات ہے کہ مجھن ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوۃ العلماء نے اصلاح تمدن اور اصلاح مراسم پر توجہ دینی شروع کر دی ہے۔ ندوۃ العلماء نے آج تک جو کچھ کیا ہے اس پر ہمیں اس وقت بحث مقصود نہیں ہے لیکن دہلی کے جلسہ سے جو علمی کارروائی کانفرنس نے شروع کی ہے، وہ واقعی قابل توجہ ہے اور اسے دیکھ کر امید بندھتی ہے کہ یہ کوشش ضرور کوئی نتیجہ پیدا کرے گی۔“ (ماہنامہ لسان الصدق، نومبر ۱۹۰۳ء ص ۵-۶، دسوی ص ۲۳)

یہ اگرچہ علامہ شبلی کا براہ راست تذکرہ نہیں ہے لیکن اس وقت علامہ شبلی ان دونوں تحریکوں سے پورے طور پر وابستہ تھے۔ علامہ شبلی فکر و خیال کی ہم آہنگی کی بنا پر تحریک ندوہ کے پہلے اجلاس منعقدہ کانپور میں شریک ہوئے اور پھر اس قدر جوش و جذبہ کے ساتھ اس میں شریک رہے کہ انہیں بجا طور پر تحریک ندوہ کے بانیوں میں شامل کیا جانا چاہئے تھا مگر بوجہ ایسا نہیں ہوا جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

اسی طرح وہ سرسید احمد خاں کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے آغاز [۱۸۸۶ء] ہی سے اس میں شامل رہے۔ اس کے اجلاسوں میں اہتمام سے شریک ہوتے، تقریریں کرتے، مباحثوں میں حصہ لیتے، تجویزیں اور قراردادیں پیش کرتے۔ ان کے بعض فارسی قصائد بھی انہی کانفرنس کے جلسوں کی بدولت کہے گئے۔ کانفرنس سے یہ دیرینہ ربط و تعلق انہیں ورثہ میں ملا تھا۔ ان کے والد شیخ حبیب اللہ اس کے نہ صرف رکن تھے بلکہ ۱۸۹۲ء میں کانفرنس نے انہیں ضلع اعظم گڑھ کا کرسپانڈنگ رکن بھی نامزد کیا تھا۔ (تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، مشاہیر علی گڑھ حصہ ۴ ص ۲۷۴) چنانچہ ۱۹۰۳ء میں کانفرنس کے اجلاس دہلی میں جب انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں آیا تو علامہ شبلی اس کے سکریٹری نامزد ہوئے۔ علامہ شبلی نے دو سال سے زائد مدت [۱۹۰۳-۱۹۰۵ء] تک اس کی ترقی کے لئے اس قدر انہماک سے کام کیا کہ اسے ایک منظم تنظیم اور فعال ادارہ بنادیا۔ ان کے انہماک کا اندازہ محض اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ابتدائی تین ماہ میں انہوں نے ملک کے

مختلف اہل علم کو انجمن سے متعلق ۱۱۹ خطوط لکھے۔ پھر اہل قلم کی ایک بڑی جماعت کو انجمن سے وابستہ کیا، اس کے ارکان بنائے۔ ترجمے کا منصوبہ بنایا، انعامات کا سلسلہ قائم کیا، ماہ بہ ماہ اس کی رپورٹ لکھی اور اس کے احوال سے قوم کو واقف کراتے رہے کہ انجمن کے مقاصد کیا ہیں اور اس کی ضروریات کیا ہیں اور انجمن کیا کام کر رہی ہے۔ یہاں ان کے خطوط سے چند اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں جن سے ان کی سرگرمیوں کا کسی قدر اندازہ ہوگا:

۱۔ بنام مولانا حمید الدین فراہی

”اردو سائنس کی کارروائی زور و شور سے شروع کرتا ہوں۔“

(مکاتیب شبلی حصہ دوم ص ۱۳)

”اردو نے اب تک جو کام کیا ہے وہ علی گڑھ گزٹ میں اس ہفتہ

چھپے گا، اس میں دیکھنا، تم بناؤ عربی زبان کی کون سی کتابیں ترجمہ کے لائق

ہیں۔“ (مکاتیب شبلی حصہ دوم ص ۱۵)

”میں اردو کے قصہ میں بہت عظیم الفرصت ہو گیا ہوں، جو وقت

پہنچتا ہے بالکل خط و کتابت میں صرف ہو جاتا ہے۔“

(مکاتیب شبلی حصہ ۲ ص ۱۵)

۲۔ بنام مہدی افادی

”اردو ادب کے ساتھ آپ کو جو عشق ہے، اب اس کے اظہار

کا موقع ہے۔ دستور العمل ارسال ہے جو کچھ ہو سکے کیجئے۔“

(مکاتیب شبلی حصہ دوم ص ۱۷۲)

”بد قسمتی سے انجمن نے اب تک صرف ایک کتاب شائع کی یعنی

گوتم بدھا اور شری کرشن کی سوانح اور فلسفہ، اچھی کتاب ہے۔“

(مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۱۷۲)

۳۔ بنام ابوالکمال سید عبدالکیم دسنوی

”کتب مشتملہ میں ہر برٹ اسپنسر کی کتاب چھپ گئی اور عنقریب

شائع ہوگی، باقی زیر طبع ہیں۔“ (مکاتیب شبلی حصہ اول ص ۲۹۰)

۴۔ بنام مولوی محمد سمیع

”انجمن ترقی اردو میں اب اس قدر ترمیم ہوئی کہ خریداران مستقل ارکان اعانت قرار دئے گئے ہیں۔ تم اپنے خریداروں کو بھی مطلع کر دو۔ انجمن کی تیار کردہ کتابیں زیر طبع ہیں۔“ (مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۱۰۷)

۵۔ بنام نواب علی حسن خاں

”انجمن کی طرف سے میں مصحفی اور میر تقی وغیرہ کی مصنفہ تذکرۃ الشعراء چھپوانا چاہتا ہوں، کیا آپ کے کتب خانہ میں ان تذکروں میں سے کوئی ہے؟“ (مکاتیب شبلی حصہ دوم ص ۱۲۷)

۶۔ بنام ریاض حسن خاں خیال

”خط پہنچا، مسودہ بوقت فرصت دیکھوں گا، کہیں کہیں تغیر و ترمیم کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ بوعلی سینا کے متعلق حبیب السیر وغیرہ میں جو کچھ ہے اور جس کی تقلید نامہ دانشوراں میں کی ہے، لغو محض ہے۔

طبقات الاطباء اور تاریخ الاطباء شہروری جو نہایت معتبر کتابیں ہیں اور ابن سینا کا مفصل حال ان میں ہے اور خوارزم کے تعلقات اور مفارقت کا بھی ذکر ہے، ان میں کہیں اس واقعہ کا پتہ نہیں، یہ شیعوں کی من گھڑت ہے۔“ (مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۱۵۶-۱۵۷)

”مولوی شہباز کی سوانح عمری میں نے دیکھی ہے۔ بہت اچھی ہے لیکن نا تمام ہے اور ان کا بیان ہے کہ تکمیل کا سامان نہیں۔ ک مسٹری کی اصطلاحات کا ترجمہ نہیں بلکہ صرف اصل الفاظ چھپوا لئے گئے ہیں کہ مترجمین کے پاس الگ الگ جلدیں بھیج دی جائیں۔“

(مکاتیب شبلی حصہ دوم ص ۱۵۶)

۷۔ بنام نواب منزل اللہ خاں

”کیا اب تک انجمن اردو اس قابل نہیں ہوا کہ آپ اس کی طرف
توجہ فرمائیں۔“ (مکتوبات شبلی، ص ۱۰۱)

اس طرح کے علامہ شبلی کے متعدد خطوط ان کے مجموعہ مکاتیب میں موجود ہیں۔ اگر ان
کا تاریخی لحاظ سے مطالعہ کیا جائے تو انجمن کی تاریخ کے بعض نئے اوراق سامنے آجاتے ہیں۔ جن
کا مطالعہ ابھی تک نہیں کیا گیا۔

انجمن کے قیام کے ۹ ماہ بعد مولانا آزاد نے لسان الصدق جاری کیا۔ اس کے
صفحات احوال شبلی، تصنیفات شبلی، خیالات شبلی اور شبلی کے حوالے سے انجمن ترقی اردو کے مسلسل
ذکر سے عبارت ہیں۔ اس کے پہلے شمارے میں انجمن کے آغاز و قیام کے ذکر کے بعد مولانا آزاد
نے شیخ محمد عبدہ اور ان کی روشن خیالی کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے لکھا ہے کہ:

”ہمارے مخدوم دوست مولانا شبلی نے بھی زمانہ سیاحت میں ان
سے ملاقات کی تھی اور ان کی روشن خیالی کا اعتراف کیا تھا۔ شیخ جمال الدین
افغانی مرحوم سے بھی ان کی صحبتیں رہی ہیں اور بقول مولانا شبلی کے ان کی
روشن دماغی کی اصل وجہ شیخ جمال الدین ہی کی صحبت ہے۔“

(لسان الصدق نومبر ۱۹۰۳ء ص ۱۲۔ دسنوی ص ۲۹)

مولانا آزاد [۱۸۸۸ء] علامہ شبلی [۱۸۵۷ء] سے عمر میں اکتیس سال چھوٹے تھے،
اس کے باوجود انہوں نے مذکورہ اقتباس میں شبلی کو مخدوم دوست سے یاد کیا ہے۔ اس سے اس
زمانہ میں ان عباقرہ کے درمیان اتفاق مذاق، انسیت اور بے تکلفی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔
لسان الصدق جس وقت جاری ہوا علامہ شبلی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری کی حیثیت
سے طرح طرح کے علمی منصوبے بنا کر انجمن کو ترقی دینے میں کوشاں تھے۔ لسان الصدق کے اسی
شمارے میں انجمن ترقی اردو اور اس کے منصوبوں کا مولانا ابوالکلام آزاد نے قدرے تفصیل سے
ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

”انجمن ترقی اردو نے اردو زبان کے علمی دائرہ کو وسیع کرنے کی یہ
صورت تجویز کی ہے کہ انگریزی، عربی، فارسی کی علمی اور فنی کتابیں مختلف اردو

میں ترجمہ کر کے شائع کی جائیں، جن کی اشاعت سے قوم میں لغو اور بے نتیجہ ناولوں کے بجائے علمی کتابوں کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو، چنانچہ انگریزی، عربی، فارسی کی جو کتابیں انجمن نے انتخاب کی تھیں، ان کے ترجمہ اور طبع کا انتظام نہایت معقول طریقہ سے ہو رہا ہے اور امید ہے کہ بہت جلد کتابیں طبع ہو کر ملک میں روشنی پھیلانیں گی۔ ان کتابوں کے فروخت کی نہایت آسان اور موزوں صورت یہ تجویز کی گئی ہے کہ جو شخص انجمن کی چھپی ہوئی کتابوں کو لینا چاہے، وہ ایک سال میں پانچ روپیہ جیسی ایک قلیل رقم کی کتابوں کو لینے کا باضابطہ انجمن سے وعدہ کر لے، ایسی حالت میں وہ مجبور نہیں کیا جائے گا کہ ایک مشمت پانچ روپیہ کی کتابیں خرید لے، بلکہ چار مرتبہ یا تین مرتبہ متفرق کتابوں کو منگوانے کا وہ مجاز ہے۔ ہماری رائے میں اس سے بہتر طریقہ کتابوں کے لینے کا، جس میں لینے والے کو کسی قسم کے بار کا احساس نہیں ہو، نہیں مل سکتا۔ ایک سال کے عرصہ میں پانچ روپوں کی کتابوں کا لینا کس قدر غیر محسوس صرف ہے؟ ہماری گزارش بالخصوص اہل بنگالہ سے ہے جن کے کان انجمن کی آوازوں سے ابھی بہت کم آشنا ہوئے ہیں کہ وہ اپنی علمی زبان کی ترقی سے غافل نہ ہوں، اور نہیں تو کم از کم انجمن کی کتابوں کی مستقل خریداری ہی سے اس اہم کام کی مدد کریں۔

باقاعدہ کارروائی ہونے کے خیال سے درخواست خریداری کے چھپے ہوئے فارم ہر شخص انجمن ترقی اردو کے سکریٹری مولانا شبلی نعمانی ”ناظم صیغہ علوم و فنون حیدر آباد دکن“ سے یا دفتر ”لسان الصدق“ سے منگوا سکتا ہے۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

ایڈیٹر لسان الصدق و رکن انتظامی ”انجمن ترقی اردو“

(لسان الصدق نومبر ۱۹۰۳ء ص ۱۳-۱۴، دسویں ص ۳۰-۳۱)

انجمن ترقی اردو کی تاریخ میں بصراحت یہ ذکر نہیں ملتا ہے کہ اس کے پہلے جلسہ انتخاب

میں مولانا آزاد اس کے رکن انتظامی نامزد ہوئے تھے، لیکن مذکورہ تحریر میں خود مولانا آزاد کے قلم سے رکن انتظامی انجمن ترقی اردو لکھا ہوا ہے۔ دراصل انجمن سے ان کی دلچسپی کی بنا پر علامہ شبلی نے انہیں رکن انتظامی نامزد کیا تھا۔ خود مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ

”اس زمانے میں محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کی شاخ انجمن ترقی اردو قائم ہو چکی تھی اور مولانا شبلی مرحوم اس کے ناظم تھے۔ انجمن ہی کے سلسلے میں میں نے ان سے خط و کتابت کی تھی اور انہوں نے خط و کتابت کے بعد مجھے بڑا شائق اور کارکن سمجھ کر انجمن کے ارکان انتظامیہ میں چن لیا تھا۔“
(آزاد کی کہانی آزاد زبانی ص ۳۰۴)

اس شمارہ میں انجمن کی رپورٹ کی اشاعت کے ساتھ ہی مولانا آزاد نے ایک مختصر سی خبر شائع کی ہے کہ:

”جناب مولانا شبلی نعمانی ناظم صیغہ علوم و فنون حیدرآباد دکن آج کل تاریخ علم الکلام کا دوسرا حصہ لکھ رہے ہیں، جس میں جدید علم کلام پر بحث کی جائے گی۔“ (لسان الصدق، نومبر ۱۹۰۳ء ص ۱۴، دسنوی ص ۳۱)

۲۔ دسمبر ۱۹۰۳ء (جلد ۱ نمبر ۲)

۳۔ جنوری ۱۹۰۴ء (جلد ۲ نمبر ۱)

یہ دونوں شمارے ذکر شبلی سے خالی ہیں۔

۴۔ فروری ۱۹۰۴ء (جلد ۲ نمبر ۳)

اس شمارے کا آغاز علامہ شبلی اور ان کی انجمن ترقی اردو کے ذکر سے ہوا ہے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں:

”محمدن ایجوکیشنل کانفرنس بمبئی میں انجمن ترقی اردو کی رپورٹ

۱۹۰۳ء جو جناب مولانا شبلی نعمانی سکریٹری انجمن نے پیش کی ہے، اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس انجمن نے اپنے سکریٹری کی بدولت ان نو مہینوں میں جو کوشش کی ہے اور جس قدر عملی نتائج اس سے پیدا ہوئے ہیں وہ کانفرنس کی زندگی میں ”پہلی کوشش سے“ تعبیر کیے جاسکتے ہیں۔ اس انجمن کے مقاصد کی تعمیل میں جس قدر رکاوٹیں اور قہقہے پیش آئیں، ان کا سرسری اندازہ اس رپورٹ کے دیکھنے سے ہو سکتا ہے، لیکن باوجود ان مشکلات کے جس قدر کارروائی ہوئی ہے، اس کی ہرگز ہمیں توقع نہ تھی۔ اکثر علمی کتابوں کا ترجمہ ہو گیا ہے اور وہ پریس میں چھپنے کے لیے بھیج دی گئی ہیں۔ بہت سی کتابوں کا ترجمہ ہو رہا ہے اور بہت سی کتابیں زیر تجویز ہیں۔ اکثر مصنفین کو میٹرل بہم پہونچا کر ان کی مدد کی گئی ہے۔ بعض کتابیں اصلاح کر کے چھاپنی جا رہی ہیں اردو زبان کے قواعد صرف و نحو کا انتظام ہو رہا ہے۔ ایک خاص کمیٹی علمی اصطلاحات کا لغت اردو میں تیار کر رہی ہے، جس کا آج تک سرانجام نہ پانا علمی تراجم میں سخت رکاوٹ پیدا کیے ہوئے تھا، اسی طرح اردو تصانیف کی ایک عمدہ فہرست بھی تیار ہو رہی ہے جس کا حصہ تاریخ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ مستقل خریداروں کی تعداد بھی ۲۳۰ تک پہنچ گئی ہے۔ جو اگرچہ اک بڑی تعداد نہیں ہے لیکن تاہم غنیمت ضرور ہے۔ الغرض مولانا شبلی بالقابہ کی بے بہا کوشش ضرور قابل تحسین ہے، کاش کہ کانفرنس کی اور شاخیں بھی اسی طرح کوشش کرتیں تو کانفرنس کا وجود ہمارے لیے رحمت الہی سمجھا جاتا، لیکن افسوس اسی کا ہے کہ اشخاص کانفرنس کی غفلتوں سے کانفرنس پر لے دے ہوتی ہے اور سرے سے اس کا وجود ہی فضول قرار دیا جاتا ہے۔“ (لسان

الصدق، فروری ۱۹۰۴ء ص ۱-۲، دسنوی ص ۶۴-۶۵)

اس کے بعد ایک دو علمی خبریں شامل اشاعت ہیں اور پھر علامہ شبلی کے قلم سے انجمن ترقی اردو کی رپورٹ بابت سال ۱۹۰۳ء شائع کی گئی ہے۔ یہ رپورٹ انہوں نے کانفرنس کے بمبئی

کے اجلاس میں پیش کی تھی۔ اس رپورٹ میں پہلے انجمن ترقی اردو کی اہمیت و افادیت اور تراجم کتب کی ضرورت واضح کی گئی ہے، پھر انجمن کی کارگزاری کی تفصیل ہے۔ اس میں دستور العمل تیار کرنا، ملک کو انجمن کے مقاصد سے روشناس کرانا، انجمن کی رکنیت قبول کرنے کے لئے مختلف اشخاص سے خط و کتابت کرنا، ہندوؤں کی ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا شامل ہے۔ آخر میں ان چند ممتاز لوگوں کے اسمائے گرامی درج ہیں جنہوں نے انجمن کی رکنیت منظور کی۔ چونکہ اس سے ۱۹۰۳ء میں علامہ شبلی کی مصروفیات اور بعض خیالات کا اندازہ ہوتا ہے اس لئے اس کا ایک طویل اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

”یہ انجمن ۴ جنوری ۱۹۰۳ء کو بمقام دہلی ایجوکیشنل کانفرنس کے غیر معمولی اجلاس میں قائم ہوئی اور بزرگان ذیل اس کے عہدہ دار اور کارکن قرار پائے۔

صدر انجمن

ٹی ڈبلیو آرئلڈ اسکوپر پروفیسر گورنمنٹ کالج، لاہور

نائب صدر

شمس العلماء ڈاکٹر مولوی نذیر احمد خان صاحب، ال، ال، ڈی

مولانا الطاف حسین صاحب حالی

شمس العلماء خان بہادر مولوی ذکاء اللہ صاحب

سکریٹری

شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی

اسسٹنٹ سکریٹری

مولوی حامد علی صاحب صدیقی سہارن پوری

۵ جنوری ۱۹۰۳ء کو کانفرنس ہی کے ایک پریویٹ اجلاس میں انجمن کے لئے ایک مختصر دستور العمل کا مسودہ طیار کیا گیا لیکن چونکہ یہ مسودہ محض سرسری طور پر طیار ہوا تھا اور اجلاس کانفرنس کے ختم ہونے کے ساتھ تمام ارکان دور دراز مقامات پر چلے گئے تھے، مسودہ کی درستی و اصلاح میں

خط و کتابت کے ذریعہ سے ایک مدت صرف ہوگئی، یہاں تک کہ ۸/۱۸ اپریل ۱۹۰۳ء کو دستور العمل مذکور چھپ کر شائع ہوا اور دراصل انجمن کے قیام کی تاریخ اسی دن سے شمار کرنی چاہئے۔ اس لحاظ سے یہ رپورٹ سالانہ نہیں بلکہ ہشت ماہہ رپورٹ ہے۔

انجمن کا سب سے پہلا کام ملک کو اپنے مقاصد کی طرف متوجہ کرنا اور یہ دریافت کرنا تھا کہ جو مقاصد انجمن کے پیش نظر ہیں ملک اس کے لئے طیار ہے یا نہیں۔ چنانچہ نہایت کثرت سے خطوط چھپوا کر شائع کئے گئے۔ اخبارات وغیرہ سے مدد لی گئی ممتاز بزرگوں کی خدمت میں خاص طرح پر تحریک کی گئی۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ ہر طرف سے لبیک کی صدائیں آئیں، ملک کے ہر فرقہ نے بلا تخصیص مقاصد انجمن کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی۔ ابتدا میں ہندو صاحبوں کو بطور خودیہ غلط خیال پیدا ہوا کہ ان کو انجمن کی شرکت سے علاحدہ رکھا گیا ہے، چنانچہ ایک ہندو اخبار نے اس کا اظہار بھی کیا لیکن جب اس کے جواب میں سکریٹری کی ایک تحریر اسی اخبار میں شائع ہوئی تو ہندو صاحبوں کے دل سے یہ شبہ جاتا رہا۔ اور سب سے پہلے آئریل راء بہادر نہال چند صاحب رئیس مظفرنگر نے انجمن کی ممبری قبول کرنے کی اطلاع دی۔

ملک میں جس قدر ممتاز اور نام آور بزرگ ہیں مثلاً آئریل نواب عماد الملک مولوی سید حسین صاحب بلگرامی، نواب محسن الملک، بدرالدین طیب جی صاحب جج ہائی کورٹ بمبئی، مشیر الدولہ خلیفہ سید محمد حسین صاحب بیرسٹریٹ لا، خان بہادر سید اکبر حسین صاحب جج عدالت خفیہ، خان بہادر مولوی عبدالغفور صاحب وزیر ریاست رام پور۔

ان تمام بزرگوں نے خوشی کے ساتھ ممبری قبول کی۔ انگلش جٹلمینوں نے بھی انجمن کی طرف توجہ ظاہر کی۔ چنانچہ ڈبلیو بیل صاحب ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب نے انجمن کا رکن اعزازی ہونا منظور کیا۔“

شبلی نعمانی

(لسان الصدق فروری ۱۹۰۳ء ص ۷-۸)

واضح رہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] کے مرتب کردہ مقالات و خطبات شبلی کی ۹ جلدیں جو دارالمصنفین نے شائع کی ہیں، اس میں یہ رپورٹ شامل نہیں ہے۔ شاید مولانا سید سلیمان ندوی کو لسان الصدق میں شائع اس رپورٹ کی اطلاع نہیں تھی؟۔ حیات شبلی میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ انہوں نے لکھا ہے کہ علامہ شبلی انجمن کی رپورٹ ہر ماہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ میں شائع کرتے تھے۔ (حیات شبلی ص ۳۲۳) انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی عدم دستیابی کی وجہ سے تصدیق نہیں ہو سکی کہ یہ رپورٹ ہر ماہ شائع ہوتی تھی یا سالانہ؟ اگر ماہ بہ ماہ بھی شائع ہوئی ہوگی تو بھی چار/پانچ ماہ سے زیادہ نہیں، حالانکہ وہ دو سال سے زاید مدت تک انجمن کے سکریٹری رہے۔

جناب مشتاق حسین صاحب جو مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ سے وابستہ تھے اور جنہوں نے شبلی و سرسید کی بعض نایاب تحریریں انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے نقل کر کے شائع کی ہیں انہوں نے اپنی کتاب باقیات شبلی میں درج ذیل رپورٹ شائع کی ہیں:

۱۔ رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ماہ اپریل ۱۹۰۳ء (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۳ مئی ۱۹۰۳ء ص ۷-۸)

۲۔ رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ماہ مئی ۱۹۰۳ء (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۳ جون ۲۰/جون ۱۹۰۳ء)

۳۔ رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ماہ جون ۱۹۰۳ء (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۵ جولائی ۱۹۰۳ء)

۴۔ رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ماہ جولائی ۱۹۰۳ء (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۹ اگست ۱۹۰۳ء)

۵۔ رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ماہ اگست ستمبر ۱۹۰۳ء (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۶/اکتوبر ۱۹۰۳ء)

۶۔ اعلان متعلق انجمن ترقی (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۶ جون ۱۹۰۳ء)

(باقیات شبلی، آزاد کتاب گھر دہلی، ۱۹۶۴ء ص ۶۲-۱۱۱)

سرسید احمد خاں کے ایک بڑے شیدائی پروفیسر اصغر عباس صاحب سابق صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی نے ”سرسید کی صحافت“ کے عنوان سے ایک بڑا موقع مقالہ لکھا ہے۔ اس میں انہوں نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا بڑی گہرائی اور باریکی بینی سے جائزہ لیا ہے۔ اس کے ایک باب میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مضمون نگاروں کا اجمالی تذکرہ اور ان کے مضامین کی فہرست درج کی گئی ہے۔ (سرسید کی صحافت ص ۱۵۸-۱۹۲) مگر علامہ شبلی کے تذکرہ اور ان کے مضامین کی فہرست میں اس طرح کی کسی رپورٹ کا ذکر نہیں ہے۔ گویا علامہ شبلی کے حوالہ سے گزٹ کے مطالعے و جائزے کا کام بھی ابھی باقی ہے۔

لسان الصدق کے اس شمارے میں مذکورہ رپورٹ کے بعد درمیان میں انجمن سے متعلق مولانا شبلی کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے، چونکہ اس مراسلے کا ذکر اب تک کہیں نہیں آیا ہے، حتیٰ کہ جن لوگوں نے انجمن کی تاریخ پر کتابیں لکھی ہیں، ان میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔ راقم نے اپنی کتاب ”علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط“ کے دیباچے میں ان کے کئی مراسلوں کا ذکر کیا ہے، لیکن معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اس میں بھی اس کا ذکر نہیں، اس لئے یہ مراسلہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

”محضن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ مقام بمبئی (صیغہ شعبہ علمیہ)

میں کثرت آراء سے یہ فیصلہ ہوا کہ انجمن ترقی اردو کے کاموں کو اس قدر وسعت ہوگئی ہے کہ اب اس کے لیے جداگانہ ایک سرمایہ کے جمع کرنے کی ضرورت ہے، اس لئے عام چندہ کھولا جائے اور جو چندہ آتا جائے اخباروں کے ذریعہ سے وقتاً فوقتاً مشتہر کیا جائے۔ اس بنا پر عام چندہ کھول دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے جو رقم وصول ہوئی ہے وہ مولوی نظام الدین حسین صاحب ڈپٹی کمشنر برار کی عطیہ ہے۔ چنانچہ رقم مع ان چندوں کے جو علم دوست حضرات نے خود عطا کئے تھے حسب ذیل ہیں:

جناب مولوی نظام الدین حسین صاحب ۱۰۰ روپے
 جناب شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب ال ال ڈی
 ۱۰۰ روپے

جناب نواب منزل اللہ خان صاحب ۵۰ روپے
 جناب خان بہادر منشی الہی بخش صاحب رئیس دہلی ۵۰ روپے
 جناب مولوی عزیز مرزا صاحب بی اے کمشنر ۵۰ روپے
 واضح ہو کہ جو صاحب سویا سو سے زائد چندہ عطا فرمائیں گے وہ
 انجمن کے ممبر اعزازی متصور ہوں گے۔ شبلی
 سکریٹری انجمن ترقی اردو
 حیدر آباد دکن

(لسان الصدق، فروری ۱۹۰۴ء ص ۱۹-۲۰، دسنوی ص ۸۱-۸۲)
 شمارہ کے آخر میں دو تبصرے شامل ہیں۔ پہلا تبصرہ مسٹر ظفر علی خاں کے رسائل افسانہ و
 دکن ریویو پر ہے اور دوسرا تبصرہ رسالہ خدنگ نظر لکھنؤ پر۔ دکن ریویو کے مضامین پر تبصرہ کرتے
 ہوئے مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ
 ”مضامین کی عمدگی کے متعلق صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ
 شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی اور مولوی عزیز مرزا صاحب بی اے جیسے
 فاضل کی تحریریں اس میں شائع ہوئی ہیں۔“ (لسان الصدق، فروری ۱۹۰۴ء
 ص ۲۳-۲۴، دسنوی ص ۸۵)

مولانا ظفر علی خاں [۱۸۷۰-۱۹۵۶ء] ایڈیٹر زمیندار علامہ شبلی کے شاگرد اور عقیدت
 کیش تھے۔ علامہ شبلی روم و مصر و شام کی سیاحت سے واپس آئے تو انہوں نے فارسی قصیدہ سے ان
 کا استقبال کیا تھا۔ (شبلی سخنوروں کی نظر میں ص ۶۷-۷۰) انہوں نے افسانہ و دکن ریویو اور
 زمیندار لاہور وغیرہ میں اپنے استاذ علامہ شبلی کی بعض تحریریں شائع کیں اور خود ان کی شخصیت پر
 مضامین لکھے۔ مذکورہ رسائل کی عدم دستیابی سے ہم اب تک ان کے مطالعے سے محروم ہیں۔ یہی

وجہ ہے کہ ان تحریروں کا اندراج کتابیات شبلی میں بھی نہیں ہو سکا ہے۔

مولانا آزاد نے لسان الصدق میں متعدد کتابوں پر تبصرے کیے ہیں۔ ان میں بعض تبصرے بڑے اہم ہیں، جیسے مولانا حالی کی ”حیات جاوید“ پر دو قسطوں میں ان کا بڑا وسیع تبصرہ شائع ہوا ہے۔ مولانا آزاد کے ہلالی تبصروں کا مجموعہ پروفیسر محمود الہی صاحب نے مرتب کر کے اردو اکادمی لکھنؤ سے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا ہے، ضرورت ہے کہ لسان الصدق کے تبصروں کو بھی یکجا شائع کر دیا جائے کہ یہ ان کی ابتدائی زندگی کے تبصرے ہیں اور پختگی کا یہ حال ہے کہ کسی وسیع المطالعہ عمر رسیدہ شخص کے قلم سے معلوم ہوتے ہیں۔

۵۔ مارچ ۱۹۰۴ء (جلد ۲ نمبر ۳)

اس شمارے میں ادارتی نوٹ کے بعد ملک میں عنقریب شائع ہونے والی کتابوں کا ذکر ہے، اس میں علامہ شبلی کی موازنہ انیس و دیر کا پہلی بار ذکر کیا گیا ہے۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ ”جناب شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی ناظم علوم و فنون حیدرآباد دکن نے میرا انیس مرحوم کے کلام پر ایک مفصل ریویو تحریر کیا ہے اور ان کے کلام کا دیگر شعراء سے مقابلہ کر کے ان کی خوبیوں کو دکھلایا ہے۔ عنقریب یہ کتاب چھپنے کے لئے مطبع میں جائے گی۔“

(لسان الصدق مارچ ۱۹۰۴ء ص ۶، دسنوی ص ۹۰)

مولانا آزاد نے جس موازنہ انیس و دیر کا ذکر کیا ہے، وہ شائع نہ ہو سکی اور نہ اس کا مسودہ حیدرآباد سے واپس ملا۔ چنانچہ علامہ شبلی نے اسے دوبارہ لکھا اور ۱۹۰۷ء میں لکھنؤ سے شائع کیا۔ اس کے بعد لسان الصدق میں ”زیر ترجمہ“ کی سرخی کے تحت پانچ کتابوں کا ذکر ہے۔ اس میں ہیر و ورشپ: اسٹوری آف پلانٹ، نامہ دانشوراں، معارف ابن قتیبہ اور لکچرز بانی میکس مولر کے اردو تراجم اور مترجمین کا ذکر ہے۔ چونکہ ان سے علامہ شبلی کی انجمن ترقی اردو کے سلسلہ کی ابتدائی سرگرمیوں، کوششوں اور کاوشوں کا اندازہ ہوتا ہے، اس لئے مولانا آزاد کی لکھی ہوئی ان علمی خبروں کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

۱۔ ہیر وورشپ

”انجمن ترقی اردو کی تحریک سے جناب مولوی عبدالغفور شہباز
کارلائل کی مشہور کتاب ہیر وورشپ کا ترجمہ کر رہے ہیں۔“

(لسان الصدق مارچ ۱۹۰۴ء ص ۶، دسنوی ص ۹۱)

۲۔ اسٹوری آف پلانٹ

”انجمن ترقی اردو کی تحریک سے اسٹوری آف پلانٹ (علم
النبات) کا ترجمہ بھی مولوی محمد اکبر صاحب بی اے کر رہے ہیں۔“

(لسان الصدق مارچ ۱۹۰۴ء ص ۶، دسنوی ص ۹۱)

۳۔ نامہ دانشوراں

”نامہ دانشوراں زمانہ حال کی ایک مستند کتاب ہے، جسے شاہ
ناصر الدین مرحوم کے امر سے علمائے ایران نے تصنیف کرنا شروع کیا
تھا، ابھی تک صرف اس کی دو جلدیں شائع ہو سکی ہیں، انجمن ترقی اردو نے
اس کے ترجمہ کے لئے اعلان کیا تھا، چنانچہ مولوی ریاض حسن خاں صاحب
اس کا ترجمہ کر رہے ہیں، جسے اراکین انجمن نے نہایت پسند کیا ہے۔“

(لسان الصدق مارچ ۱۹۰۴ء ص ۶، دسنوی ص ۹۱)

۴۔ المعارف

”علامہ ابن قتیبہ کی معارف عربی کی نہایت عمدہ کتاب ہے۔ جس
کا اردو میں ترجمہ ہونا نہایت ضروری تھا۔ رسالہ البیان لکھنؤ کے فاضل اور
ادیب ایڈیٹر جناب مولوی عبداللہ عمادی اس کے ترجمہ میں مشغول ہیں۔“

(لسان الصدق مارچ ۱۹۰۴ء ص ۶، دسنوی ص ۹۱)

۵۔ ہمبرٹ لکچر زبائی میکس مولر

”پروفیسر میکس مولر السنہ مشرقی کا ایک مشہور فرانسیسی فاضل گذرا
ہے۔ ہندوؤں کی مقدس کتاب وید سے سب سے پہلے اسی نے یورپ کو شناسا

کیا۔ اسی کے متعلق ایک کتاب ہمبرٹ لکچر زبائی میکس مولر ہے۔ انجمن ترقی اردو نے اس کا ترجمہ بھی اردو میں ہونا ضروری قرار دیا تھا، چنانچہ مولوی عبدالقادر صاحب ایم اے پروفیسر علی گڑھ وائیڈیٹر حصہ اردو علی گڑھ منتقلی اس کا ترجمہ کر رہے ہیں۔“

(لسان الصدق مارچ ۱۹۰۴ء ص ۶، دسنوی ص ۹۱)

آخر میں ”زیر طبع“ کے عنوان سے ہر برٹ اسپنر کی کتاب کے ترجمہ کا ذکر ہے۔ یہ ترجمہ غلام الحسین صاحب بی اے نے کیا ہے۔ اور یہ بھی اطلاع دی گئی ہے کہ یہ ترجمہ انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام رفاہ عام پریس لاہور میں طبع ہو رہا ہے۔ (لسان الصدق مارچ ۱۹۰۴ء ص ۶، دسنوی ص ۹۲) چنانچہ یہ ترجمہ فلسفہ تعلیم کے نام سے ایک سال بعد ۱۹۰۴ء میں علامہ شبلی نے شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن بابائے اردو مولوی عبدالحق کے زمانہ نظامت میں شائع ہوا۔

واضح رہے کہ مذکورہ بالا تراجم دراصل علامہ شبلی کے منصوبہ تراجم کا حصہ ہیں، جو انہوں نے ترقی اردو کے لئے تیار کیا تھا، مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں ان کتابوں کی ایک فہرست درج کی ہے جس میں چودہ کتابوں کے نام درج ہیں۔ راقم نے اس کی تصدیق کے لئے انجمن کی روداد دیکھی تو ان کی تعداد ۲۳ نکلی۔ اس میں محض دو کتابیں علامہ شبلی کے دور نظامت میں شائع ہوئیں، بقیہ کتب و تراجم میں سے چند ایک مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی، مولوی عزیز مرزا اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کے زمانہ نظامت میں شائع ہوئیں۔ بقیہ کے احوال سے واقفیت نہیں۔

لسان الصدق کے اس شمارے کے آخری صفحہ پر انجمن ترقی اردو سے متعلق علامہ شبلی کے قلم سے دو اطلاعات چھپی ہیں:

۱۔ انجمن ترقی اردو

”۱۳ فروری ۱۹۰۴ء کو انجمن کا ایک غیر معمولی اجلاس ہوا۔

سکرٹری نے بیان کیا کہ چونکہ مسٹر آرنلڈ صاحب بوجہ ترک تعلق ہندوستان

انجمن ہذا کی پریسیڈنٹی سے علیحدہ ہونے والے ہیں اس لئے انجمن کی طرف ان کی توجہ اور سرگرمی کے شکریہ میں جو انہوں نے انجمن کی ترقی کے متعلق برابر مبذول رکھی، کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ باتفاق یہ طے ہوا کہ جناب ممدوح کی خدمت میں ایک ایڈریس انجمن کی طرف سے پیش کیا جائے جس کو سکریٹری اور بعض ممبر بمبئی میں جناب ممدوح کی خدمت میں حاضر ہو کر پیش کریں گے۔

اس کے بعد جدید پریسیڈنٹ کے انتخاب کے متعلق بحث ہوئی اور قرار پایا کہ باہر کے ارکان سے بھی رائے طلب کی جائے۔
(لسان الصدق، مارچ ۱۹۰۴ء ص ۲۴، دسنوی ص ۱۰۶)

۲۔ جدید پریسیڈنٹ انجمن ترقی اردو

”خیر خواہان انجمن اس خبر کو خوشی سے سنیں گے کہ جناب مسٹر آرملڈ کے بجائے جو کہ بوجہ ترک تعلق ہندوستان انجمن کی پریسیڈنٹی سے مستعفی ہو گئے ہیں۔ مسٹر ڈبلیو بیل صاحب سی آئی ڈاٹر کٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب نے انجمن کی پریسیڈنٹی منظور فرمائی ہے۔ جناب مسٹر آرملڈ صاحب کی علاحدگی کا اگرچہ انجمن کو نہایت صدمہ ہے لیکن امید ہے کہ جناب مسٹر بیل صاحب کا اس عہدہ کا قبول کرنا اس صدمہ کو کم کر دے گا۔

شبلی نعمانی

(لسان الصدق، مارچ ۱۹۰۴ء ص ۲۴، دسنوی ص ۱۰۶)

۶۔ اپریل ۱۹۰۴ء (جلد ۲ نمبر ۴)

اس شمارہ میں علامہ شبلی کا ذکر نہیں ہے۔

۷۔ مئی ۱۹۰۴ء (جلد ۲ نمبر ۵)

اس شمارہ میں براہ راست علامہ شبلی کا ذکر نہیں ہے، لیکن اس میں سید محمد سعید بلگرامی کا ایک مضمون ”حقوق نسواں اور اس کے متعلق ایک بڑی غلط فہمی کی اصلاح“ شائع ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے تعلیم نسواں پر بحث کر کے ثابت کیا ہے کہ تعلیم نسواں نہ ہونے کی وجہ سے معاشرے میں متعدد خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اس مضمون کے ادارتی نوٹ میں مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ:

”منجملہ اور خرابیوں کے جو تعلیم نسواں کے نہ ہونے سے پیدا ہو رہی ہیں ایک بہت بڑی خرابی اصلاح معاشرت کے متعلق ہے۔ مولانا شبلی عصر جدید کے قابل ایڈیٹر کو لکھتے ہیں کہ سب سے عمدہ ذریعہ بچا اصراف کے روکنے کا عورتوں کو تعلیم دینی ہے۔ فی الحقیقت مولانا کی رائے بالکل صحیح ہے اور واقعات اس کی شہادت دے رہے ہیں۔“ (لسان الصدق جون ۱۹۰۴ء

ص ۳۹-۴۰، سنوی ص ۱۸۸-۱۸۹)

ماہنامہ عصر جدید لکھنؤ خواجہ غلام الثقلین [۱۸۷۲-۱۹۱۵ء] نے جاری کیا تھا۔ وہ جب لکھنؤ سے میرٹھ منتقل ہوئے تو عصر جدید کا دفتر بھی میرٹھ منتقل ہو گیا اور وہاں سے غالباً ۱۹۱۵ء ان کی وفات تک نکلتا رہا۔ مولانا آزاد کے مذکورہ نوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم نسواں کے سلسلے میں علامہ شبلی نے عصر جدید میں اپنی کوئی رائے لکھی تھی، یہ تحریر یا خط کہیں دستیاب نہیں ہے۔ واضح رہے کہ خواجہ غلام الثقلین علامہ شبلی کے علی گڑھ میں شاگرد رہ چکے تھے۔ یہ خط یا تحریر اگر دستیاب ہو تو تعلیم نسواں کے متعلق علامہ شبلی کے موقف کی مزید وضاحت ہو سکتی ہے۔

۸۔ جون جولائی ۱۹۰۴ء (جلد ۲ نمبر ۶-۷)

اس شمارے میں ”ہم اور ہمارے ہم عصر“ کے عنوان سے مولانا ابوالکلام آزاد نے دکن ریویو حیدر آباد مئی ۱۹۰۴ء [ایڈیٹر: مولانا ظفر علی خاں] پر تبصرہ کیا ہے۔ یہ تبصرہ کیا ہے محض علامہ شبلی کے ایک مضمون کا ذکر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”مئی [۱۹۰۴ء] کا ”دکن ریویو“ اپنی معمولی ضخامت سے کچھ زائد صفحات پر شائع ہوا ہے، جس میں سب سے زیادہ قابل توجہ ہمارے مخدوم مولانا شبلی کا مضمون ہے، جو احیائے علوم عربیہ کے متعلق ایک حد سے گزاری ہوئی تحریر کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اخبار کے ناظرین میں سے شاید ہی کوئی اس طول طویل بحث سے واقف نہ ہو جو مسٹر مارلین کی جدید اسکیم کے متعلق علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے نکل کر ہندوستان کے تمام اردو اخباروں میں پھیل گئی تھی اور جس کا خاتمہ حال میں نواب لفٹنٹ گورنر کی ملاقات پر ہوا ہے۔ ایک تحریر اسی بحث کے متعلق علی گڑھ منتقلی میں شائع ہوئی تھی جس میں علوم عربیہ کے متعلق نہایت دریدہ دینی کے ساتھ ایک زبان دراز نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ”عربی زبان میں علوم و فنون کے کسی عمدہ ذخیرہ کا ہونا بالکل بعید از قیاس ہے۔“ اور نیز یہ کہ ”ہمیں اس رائے سے قطعی اختلاف ہے کہ عربی میں ایسے علوم موجود ہیں۔ جن کی تعلیم ہمارے دماغوں میں روشنی، دلوں میں صفائی، خیالات میں پاکیزگی ارادوں میں بلندی، طبیعتوں میں استقلال پیدا کر دے گی۔“

پہلا دعویٰ جس قدر لغو اور بے دلیل ہے وہ صرف اس سے ظاہر ہے کہ آج یورپ کے مستند فلاسفر اور مشہور مصنف عربی زبان کی خوشہ چینی کے قائل ہیں۔ عربی کا فلسفہ، عربی کا اخلاق، عربی کی شاعری، مدتوں یورپ کے مدرسوں میں مغربی دنیا کا کورس رہی ہے۔ اس دعویٰ کے لئے اگرچہ کسی تفصیل کی ضرورت نہ تھی مگر مولانا نے اس کا مفصل جواب لکھ کر اس بین دعویٰ کو اور مدلل کر دیا ہے۔ رہا ریڈیکل صاحب کا دوسرا دعویٰ کہ ”عربی علوم سے روشن دماغی، خیالات کی بلندی وغیرہ نہیں حاصل ہو سکتی ہے“ تو اس کا غلط ہونا بھی ظاہر ہے۔ آخر ان لوگوں نے کس زبان کی تعلیم پائی تھی اور کون سے علوم پڑھے تھے جو خیالات بلند دماغ روشن دل صاف طبیعت مستقل

رکھتے تھے اور جنہوں نے عرب کی خاک سے پیدا ہو کر آج یورپ کو اپنا مداح بنایا ہے؟ لیکن ریڈیکل صاحب اگر اس دعوے کو ان لفظوں میں بیان کرتے کہ ”مشرقی علوم ہمیں آج پڑھائے جاتے ہیں اور جن کی طرف ہمیں بلایا جاتا ہے۔ ان سے نہ ہمارے دماغ روشن ہو سکتے ہیں، نہ خیالات میں بلندی اور آزادی آسکتی ہے اور نہ طبیعت میں استقلال پیدا ہو سکتا ہے“، تو یہ قول ان کا بالکل ٹھیک اور اصلیت کے موافق ہوتا۔ یہ نہ صرف ریڈیکل صاحب کا قول ہوتا بلکہ مرحوم سرسید بھی ان کے ہم زبان نظر آتے ہیں۔“ (لسان الصدق مئی ۱۹۰۴ء ص ۱۱، دسنوی ص ۱۲۷)

مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ شبلی کا یہ مقالہ مقالات شبلی جلد سوم [ص ۱۶۴ - ۱۷۶] میں شائع کیا ہے۔

۹۔ اگست ستمبر ۱۹۰۴ء (جلد نمبر ۸-۹)

اس شمارے کا آغاز اس خبر سے ہوا ہے:

”الندوہ یعنی مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار علمی رسالہ جس کا مقصد علوم اسلامیہ کا احیاء، تطبیق معقول و منقول اور علوم قدیمہ و جدیدہ کا موازنہ ہے، جمادی الاول ۱۳۲۲ھ [اگست ۱۹۰۴ء] سے شائع ہو گیا۔ اس کے ایڈیٹر شمس العلماء مولانا شبلی اور مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی ہیں۔ قیمت سالانہ قسم اول مع محصول [چار روپے] اور قسم دوم [چھ روپے] درخواست خریداری منیجر کے نام دفتر ندوۃ العلماء شاہ جہاں پور کے پتہ پر کی جائے۔ مفصل ریویو آئندہ نمبر میں درج ہوگا۔ ایڈیٹر

(لسان الصدق اگست ستمبر ۱۹۰۴ء ص ۱، دسنوی ص ۹۱)

اس شمارہ کا پہلا مضمون مولانا آزاد کے قلم سے ”ترقی اردو اور ترقی علوم و فنون“ کا سلسلہ نمبر-۱ ہے۔ اس میں انہوں نے علمی قومی ترقی کے لئے مختلف علوم و فنون کے ترقی کی اہمیت و

افادیت بیان کی ہے۔ واضح رہے کہ مولانا آزاد کے مطابق ایک خاص پس منظر میں سرسید احمد خاں [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] تراجم سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ علامہ شبلی نے علی گڑھ کالج سے وابستگی کے ابتدائی زمانہ میں اپنا معرکہ آراء مقالہ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم لکھا تو اس میں تراجم کے سلسلہ میں سرسید کے موقف کی تائید کی تھی۔ مولانا آزاد نے علامہ شبلی سے اس سلسلہ میں استفسار کیا اور ان کا خیال معلوم کیا، اس کے جواب میں علامہ شبلی نے لکھا کہ

”مکرمی!

آپ کا دلچسپ والا نامہ پہنچا.....

ترجمہ کا میں مخالف نہیں ہوں۔ ”گذشتہ تعلیم“ میں سرسید نے مجھ سے وہ عبارت بہ جبر لکھوا دی تھی۔ میں نے سخت انکار کیا تھا لیکن ان کا اصرار غالب آیا۔ میں تو ترجمہ کو اصلی علمی خدمت سمجھتا ہوں، بلکہ انشاء اللہ اس کا ایک باضابطہ سررشتہ قائم کروں گا۔

۲۲ مارچ ۱۹۰۳ء

(لسان الصدق اگست ستمبر ۱۹۰۴ء ص ۹، سنوی ص ۲۰۰-۲۰۱)

علامہ شبلی کی یہ رائے اور ان کا یہ خط لسان الصدق کے علاوہ اب تک کہیں اور شائع نہیں ہوئے۔ مولانا آزاد نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”مولانا کے اس اختلاف کی حقیقت یہ ہے جو انہوں نے اس خط میں ظاہر فرمائی ہے۔ سرسید کو ہائی ایجوکیشن کی حمایت میں جو جوش پیدا ہوا تھا وہ تراجم کے سلسلے کا سخت مخالف تھا۔ انہیں خوف تھا کہ کہیں تعلیمی ضرورتوں سے بالکل چشم پوشی نہ کر لی جائے اور صرف تراجم کے سلسلے کو قائم کرنا قوم کی علمی ترقی کے لیے کافی نہ سمجھ لیا جائے۔ یہی خیال ان کو بار بار آمادہ کرتا تھا کہ وہ اس امر کو زور کے ساتھ ظاہر کریں اور قوم کی تمام طاقت پہلے تعلیم کی طرف متوجہ کرالیں۔ اسی خیال کا اثر تھا کہ ”گذشتہ تعلیم“ میں مولانا کے قلم سے بھی مخالفت ظاہر کرائی گئی، ورنہ درحقیقت مولانا کی رائے وہی ہے جو

انہوں نے اس خط میں ظاہر کی ہے۔“ (لسان الصدق اگست ستمبر ۱۹۰۴ء

ص ۹-۱۰، دسنوی ص ۲۰۱)

تراجم کے سلسلے میں اس وقت سرسید احمد خاں کا موقف جو بھی رہا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے علامہ شبلی کی علی گڑھ کی وابستگی سے بہت پہلے سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی تھی، جس کا بنیادی مقصد مغربی علوم و تصنیفات کا اردو میں ترجمہ کرنا تھا۔ چنانچہ سوسائٹی نے چالیس کتابوں کے ترجمے شائع کئے۔ (اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ ص ۱۱۳)

لسان الصدق کے اسی شمارے میں عنقریب شائع ہونے والی کتابوں کا ذکر مولانا آزاد کے قلم سے ہے۔ اس میں علامہ شبلی کی دو کتابوں الکلام اور سوانح مولانا روم کا نام شامل ہے۔ الکلام کا ایک سطری ذکر ہے۔ البتہ سوانح مولانا روم کا کسی قدر تفصیلی۔ مولانا آزاد نے اس کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

”مولانا روم کی مثنوی فارسی لٹریچر کی جان سمجھی جاتی ہے اور صوفیا تو اپنے مقدس لہجہ میں اس کو ”قرآن پہلوی“ کے خطاب سے یاد کرتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ مثنوی کی یہ مقبولیت یا تو شاعرانہ حیثیت سے ہے یا اس لئے کہ اس کو تصوف و معارف کا مجموعہ تسلیم کر لیا گیا ہے، حالانکہ مولانا شاعر تھے اور نہ انہوں نے مفروضہ تصوف کے وہ خیالات اس میں بھرے ہیں جن سے اس کی وقعت کی جاتی ہے۔ بلکہ درحقیقت ایک اعلیٰ درجہ کی فلسفیانہ تصنیف ہے، جس کو زمانہ کے عام رجحان کا اندازہ کر کے صوفیانہ پیرایہ میں اور شاعرانہ صورت میں فاضل مولوی نے پیش کیا ہے۔ اسی راز کی طرف وہ اشارہ ہے جس پر بہت کم لوگوں نے غور کیا ہوگا، ”گفتہ آید در حدیث دیگر ان“

حواشی و شروح جتنے لکھے گئے ہیں ان میں اکثر تشریحات من چہ سرائم و طنزہ من چہ سرآید کے مصداق ہیں، اس لئے ایک ایسے ریویو کی سخت ضرورت تھی جو اگر مفصلاً نہیں تو مجملًا ہی مثنوی کی اس اصلی تہ پر لوگوں کو

متوجہ کرے۔ مولانا شبلی نعمانی نے اسی خیال سے مولانا کی سوانح عمری ترتیب دی ہے اور مثنوی کے فلسفیانہ پہلو کو نظائر و امثال کے ساتھ ثابت کیا ہے۔ یہ کتاب نہایت سرعت سے چھپ رہی اور غالباً الکلام کے بعد شائع ہوگی۔ ان دونوں کتابوں کے لئے خود مصنف سے ”صیغہ علوم و فنون حیدرآباد دکن“ کے پتے سے درخواست کیجئے۔“ (لسان الصدق اگست ستمبر ۱۹۰۴ء ص ۲۸، دسنوی ص ۲۱۹)

اس کے بعد کے لسان الصدق [اکتوبر تا ستمبر ۱۹۰۴ء اور جنوری تا مارچ ۱۹۰۵ء] کے شمارے دستیاب نہیں، غالباً شائع نہیں ہوئے۔

۱۰۔ اپریل، مئی ۱۹۰۵ء (جلد ۳ نمبر ۱-۲)

یہ لسان الصدق کی دوسری جلد کا پہلا شمارہ ہے۔ اس میں مولانا آزاد نے اس کے اسباب و مقاصد پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کی مقبولیت اور معاصر رسائل اور اہل قلم کے تاثرات بھی نقل کئے ہیں۔ اسی سلسلہ کلام میں انہوں نے ان بزرگوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے لسان الصدق کی قلمی سرپرستی منظور کی ہے۔ اس میں علامہ شبلی نعمانی کا نام سرفہرست ہے۔ (لسان الصدق اپریل مئی ۱۹۰۵ء ص ۱۲، دسنوی ص ۲۳۸)

اس زمانہ میں علامہ شبلی دو بڑے حادثوں سے دوچار ہوئے۔ ایک کم سن بیٹے اور ایک صاحبِ اولاد بیٹی نے اچانک انتقال کیا۔ مولانا آزاد نے گہرے تعلق اور لسان الصدق کے سرپرست کے ساتھ ہوئے ان حادثوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”بشّ العلماء مولانا شبلی نعمانی نے بہ لحاظ اس خاص شغف و عنایت کے جو ایک عرصہ سے ہمارے حال پر فرما رہے ہیں اور (بہ لحاظ اس خصوصیت کے جو ہم کو مولانا کے تمام خادموں میں حاصل ہے) وعدہ فرمایا تھا کہ جنوری کے نمبر کے لئے کوئی مضمون ضرور عنایت فرمائیں گے لیکن افسوس ہے کہ لسان الصدق کے سادے صفحات ادھر تو اس مضمون کا انتظار کر رہے

تھے اور ادھر مولانا مختلف پریشانیوں میں مبتلا ہو کر ایسے وعدے پر مجبور ہو رہے تھے۔ مضمون پہنچا اور یہ پہنچا کہ ایک غیر سن بچہ اور ایک صاحب اولاد صاحبزادی کے انتقال نے مولانا کے دل و دماغ کو سخت صدمہ پہنچایا ہے۔ یہ ایک ایسا افسوس ناک واقعہ تھا جس پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے۔ مختلف بیماریوں نے پیشتر ہی مولانا کے دل و دماغ کو کچھ کم صدمہ نہ پہنچایا تھا جس پر اس جانگزا واقعہ نے اور اضافہ کر دیا۔ خدا کرے کہ اس صدمہ کا ہوش یا اثر ان کے دل و دماغ سے بہت جلد دور ہو جائے تاکہ وہ پھر اپنی اس ڈیوٹی کے ادا کرنے پر آمادہ ہو جائیں جو کلک قدرت نے ان کے لئے مخصوص کر دی ہے۔ ممکن تھا کہ اگر ہمارا اصرار بڑھتا تو وہ ہمارے ناکام امید کے کامیاب کرنے کی کوشش کرتے، لیکن درحقیقت وہ خادم سخت نالایق ہے جو اپنے قابل احترام خدم کو ایسی پریشانیوں میں تکلیف دینے کی جرأت کرے۔ اس لئے ہم مولانا کی آئندہ عنایتوں کے امیدوار ہو کر اس بے جا جرأت سے باز رہے۔“ (لسان الصدق اپریل مئی ۱۹۰۵ء ص ۱۸-۱۹، دسنوی ص ۲۴۲)

علامہ شبلی کے اکلوتے بیٹے حامد حسن نعمانی [ڈپٹی کلکٹر] کی پیدائش کے ۲۴ سال بعد ان کے یہاں دوسرا بیٹا پیدا ہوا تھا، علامہ شبلی کو اس سے کس قدر لگاؤ تھا اس کا اندازہ ان کے ایک خط کے اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

”اس پیرانہ سالی میں خدا نے مجھ کو پھر باپ بنایا، کتاب سے

گھبراتا ہوں تو اس سے جی بہلاتا ہوں۔“ (مکاتیب شبلی حصہ دوم ص ۱۷۳)

اس کے انتقال سے وہ بے حد افسردہ و ملول ہوئے۔ اسی ماہ میں ان کی چھوٹی بیٹی رابعہ نے جو بندول ہی میں بیاہی تھیں اور صاحب اولاد تھیں یکا یک انتقال کیا۔ ان حادثات کا ذکر غالباً مولانا آزاد کے علاوہ کسی اور مدیر نے نہیں کیا۔ مولانا آزاد کے مذکورہ بالا اقتباس میں صرف ان حادثات کی اطلاع ہی نہیں ہے بلکہ علامہ شبلی سے ان کے جذباتی تعلق کا اظہار بھی ہے۔ حالانکہ اب تک دونوں کے درمیان خط و کتابت ہی کے ذریعہ رابطہ تھا، ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔ واضح

رہے کہ مولانا آزاد کی شبلی سے ۱۹۰۵ء میں بمبئی میں ملاقات ہوئی۔ اس وقت لسان الصدق کی اشاعت بند ہو چکی تھی۔ اس کے کئی ماہ بعد علامہ شبلی نے انہیں ماہنامہ الندوہ کی ادارت کے لئے راضی کیا اور جب وہ لکھنؤ آئے تو علامہ شبلی کی دوسری بیوی [جو موضع خاص ڈیہہ، ضلع اعظم گڑھ کے نعیم الرحمن صاحب کی بیٹی اور مولوی محمد سمیع صاحب کی ماموں زاد بہن تھیں] اعظم گڑھ میں سخت علیل تھیں۔ مولانا آزاد ان کی عیادت کے لئے اعظم گڑھ آئے، مگر وہ جس وقت اعظم گڑھ پہنچے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب مولانا آزاد اعظم گڑھ تشریف لائے۔ چند روز قیام کے بعد دونوں ساتھ ہی لکھنؤ واپس گئے۔ اس زمانہ میں ماہنامہ الندوہ بڑے آب و تاب سے نکل رہا تھا، لیکن علامہ شبلی کی اہلیہ کے انتقال کی خبر اس میں شائع نہیں ہوئی اور نہ ان سے متعلق کسی قسم کی معلومات دستیاب ہیں۔ حتیٰ کہ حیات شبلی میں بھی ان کے متعلق کچھ درج نہیں ہے۔ اس سے پہلے اپریل ۱۹۰۴ء کے شمارے میں علامہ شبلی کی کتاب الکلام کا ایک سطری ذکر تھا، اس شمارے میں مولانا آزاد نے اس کا مختصر تعارف لکھا ہے:

”شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کی جدید تصنیف الکلام جس کا پبلک نہایت بے چینی سے انتظار کر رہی تھی، نامی پریس کان پور سے اس خوبی اور خوش نمائی کے ساتھ چھپ کر نکلی جس کی نظیر اردو کی کوئی کتاب پیش نہیں کر سکتی۔ کہا جاسکتا ہے کہ بلحاظ اہمیت مضمون کتاب کی معنوی حالت جس قدر باعظمت ہے اسی قدر کتاب کی ظاہری صورت بھی دلفرہبی اور دلآویزی میں بے مثل اور بے نظیر ہے۔ مجلد کی قیمت [تین روپیہ آٹھ آنہ] اور غیر مجلد [دو روپیہ آٹھ آنہ] قرار دی گئی ہے۔ دفتر معتمد تعمیرات عامہ حیدرآباد دکن سے درخواست پر مل سکتی ہے۔“

(لسان الصدق اپریل مئی ۱۹۰۵ء ص ۲۹، دسنوی۔ ۲۵۱)

مولانا آزاد نے انجمن ترقی اردو پر لکھنے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ دراصل علامہ شبلی اور انجمن سے تعلق کی بنیاد پر قائم تھا۔ اس شمارہ میں ان کے مضمون ”ترقی اردو“ کی دوسری قسط بھی شائع ہوئی ہے۔ اسی شمارہ پر لسان الصدق کا خاتمہ ہو گیا۔

لسان الصدق کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کی علامہ شبلی سے گہری وابستگی، والہانہ شیفگی اور دلی عقیدت کا زمانہ لسان الصدق کی اشاعت کا زمانہ ہے۔ ماہنامہ الندوہ لکھنؤ سے وابستگی اور لکھنؤ کا قیام بعد کا قصہ اور قدیم تعلقات کا نتیجہ ہے۔

لسان الصدق کے صفحات میں علامہ شبلی کی علمی سرگرمیوں اور اس زمانہ کی تصنیفات کا بھرپور ذکر ملتا ہے۔ ان کے علاوہ انجمن ترقی اردو کی [جس میں علامہ شبلی نے سکریٹری کی حیثیت سے اپنا فریضہ انجام دیا] مدون تاریخ کے بعض نئے اوراق سامنے آتے ہیں۔ مثلاً علامہ شبلی نے محض تصنیفات و تراجم ہی کا منصوبہ نہیں بنایا تھا بلکہ اس کے ذریعہ سے علماء و فضلا اور مترجمین کی ایک جماعت کو انجمن سے وابستہ کر لیا تھا۔ تراجم کی جانچ پڑتال کے لئے بھی ایک حلقہ قائم کیا تھا جس میں علامہ اقبال وغیرہ شامل تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے صرف و نحو اور وضع اصطلاحات کے لئے بھی کوشش کی، جس کی اہمیت کے پیش نظر مولانا آزاد نے لسان الصدق میں اس کا ذکر کیا اور علامہ شبلی کی کوششوں کو استحسان کی نظر سے دیکھا ہے۔

علامہ شبلی کے انجمن سے ۱۹۰۵ء میں مستعفی ہو جانے اور مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اور مولوی عزیز مرزا کی نظامت [علی الترتیب ۱۹۰۵-۱۹۰۹ء اور ۱۹۰۹-۱۹۱۲ء] کے بعد انجمن کی باگ ڈور بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ہاتھوں میں آئی اور انہوں نے انجمن کی ترقی کے لئے بے انتہا کوشش کی۔ نہ صرف کتابوں کی تصنیف و اشاعت کا سلسلہ قائم رکھا بلکہ انہوں نے کئی رسائل جاری کئے، انجمن کا پریس قائم کیا، اردو کے حقوق کی بازیابی کے لئے جدوجہد کی، اردو کے اسکول و کالج قائم کئے، اردو یونیورسٹی کا منصوبہ بنایا لیکن انجمن ترقی اردو کی علمی و تصنیفی بنیاد وہی رہی جو شبلی نے رکھی تھی۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے ہولناک فسادات نے انجمن کو براہِ کردیا۔ اس وقت تک انجمن نے جو کتابیں اور تراجم شائع کئے یا جن بنیادی منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچایا گیا وہ بیشتر علامہ شبلی نعمانی کے منصوبے کا حصہ اور ان کے تخیلات کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً علامہ شبلی نے وضع اصطلاحات اور اس کی تدوین کو ضروری قرار دیا تھا۔ چنانچہ انجمن کی فہرست مطبوعات میں اس سے متعلق متعدد کتابیں شامل ہیں۔ اسی طرح انہوں نے اردو صرف و نحو کی ترتیب پر توجہ دی تھی۔

انجمن نے پہلے مولانا حمید الدین فراہی کی مشہور کتاب اسباق النحو شائع کی، پھر بابائے اردو کی کتاب قواعد اردو شائع ہوئی۔ انجمن ترقی اردو نے بنیادی طور پر ادب، سائنس، قواعد اور وضع اصطلاحات پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ یہ تمام امور علامہ شبلی کے پیش نظر تھے۔ (ملاحظہ رپورٹ انجمن ترقی اردو از علامہ شبلی نعمانی، مشمولہ باقیات شبلی ص ۶۲-۱۱۰) یہ الگ بات ہے کہ بابائے اردو نے اس کا اعتراف نہیں کیا ہے۔

اردو کی ترقی کے لئے علامہ شبلی نعمانی نے تصنیف و تالیف اور تراجم کا جو منصوبہ بنایا تھا اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کی انہوں نے بے انتہا کوششیں کیں۔ ان کے عہد میں مالی دشواریوں کے سبب محض دو کتابیں ہی شائع ہو سکیں، البتہ کئی کتابیں اور ترجمے مکمل ہو کر دفتر میں آچکے تھے، مگر ان میں چند ہی کتابیں انجمن نے شائع کیں اور بعض دوسرے اداروں سے شائع ہوئیں جیسے تاریخ التاریخ از مولانا محمد مرتضیٰ [مطبوعہ روز بازار اسٹیم پریس امرتسر، ۱۹۱۱ء] وغیرہ۔ فہارس کا کام بھی علامہ شبلی کے پیش نظر تھا۔ اس سلسلہ کی پہلی کاوش مولوی سجاد مرزا بیگ دہلوی نے ”الفہرست“ کے نام سے انہیں کے ایما پر تیار کی تھی۔

(وضاحتی کتابیات ص ۲۵، ترقی اردو بیورو دہلی)

ان امور میں بعض کا ذکر لسان الصدق کے صفحات میں ضمناً آیا ہے اور بعض کا نہیں، ضرورت ہے کہ لسان الصدق، مکاتیب شبلی اور انجمن ترقی اردو کی ابتدائی رودادوں کی روشنی میں انجمن سے متعلق علامہ شبلی کی گراں قدر خدمات کا مفصل جائزہ لیا جائے، اس لئے کہ انجمن کی تاریخ میں ان کا ذکر ضمنی ہو کر رہ گیا ہے۔

علامہ شبلی اور الہلال

الہلال کا اجرا مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔ یہ اردو صحافت کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے ہندوستانی معاشرہ بالخصوص مسلمانوں میں ایک انقلاب برپا کیا، اس نے ملک و ملت کے ہر طبقہ کو خاص طور پر متاثر کیا۔ علامہ شبلی بھی اس سے بے حد متاثر ہوئے، اس کے متعدد اسباب میں سب سے بڑا سبب فکر و نظر کا اتحاد تھا۔ علامہ شبلی جس سیاسی فکر کے علم بردار تھے مولانا ابوالکلام آزاد اور الہلال اسی کے ترجمان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ شبلی نے اس سے بے حد دلچسپی لی۔ نہ صرف اپنی تخلیقات و نگارشات اس میں مسلسل شائع کرائیں بلکہ ان کے بعض بے حد اہم منصوبے بھی اسی کے ذریعہ منصوبہ شدہ ہوئے۔ سیرۃ النبی ان کا آخری اور عظیم الشان تصنیفی کارنامہ ہے۔ اس کا آوازہ و شہرہ الہلال ہی کے صفحات سے بلند ہوا۔ اسی طرح دارالعلوم ندوہ کے اختلافات اور اس کی حمایت و مخالفت کی تاریخ بھی الہلال کے اوراق میں پوشیدہ ہے۔ غرض جہان شبلی کی تفصیلات لسان الصدق اور زمیندار کی طرح الہلال میں بھی بکھری پڑی ہیں، یہاں ان کا ایک اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے۔

علامہ شبلی سے مولانا آزاد کے مراسم کا آغاز ۱۹۰۱ء میں ہوا، جب انھوں نے عربی کتابوں کی دستیابی کے سلسلے میں علامہ شبلی کو خط لکھا اور علامہ نے اس خط کا جواب دیا، اس کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہوا، جیسا کہ مولانا آزاد نے آزاد کی کہانی خود آزادی کی زبانی میں بصراحت لکھا ہے۔

مولانا آزاد نے ۱۴/۱۵ سال کی عمر میں کلکتہ سے لسان الصدق جاری کیا تو اس کے علمی معاونین میں علامہ شبلی سرفہرست رہے۔ اس زمانہ میں علامہ شبلی انجمن ترقی اردو کے پہلے سکریٹری کی حیثیت سے انجمن کو فروغ دینے میں مصروف تھے۔ چنانچہ انھوں نے مولانا آزاد کی گہری

دلچسپی کی بنا پر انھیں انجمن کا رکن نامزد کیا اور ان کے رسالے لسان الصدق کو انجمن کا ترجمان قرار دے کر انجمن کی رپوٹیں اور دیگر تفصیلات لسان الصدق میں اشاعت کے لئے بھیجیں، اس کی تفصیل راقم نے اپنے مضمون ”علامہ شبلی اور لسان الصدق“ میں پیش کی ہے۔

لسان الصدق جس وقت بند ہوا علامہ شبلی اس وقت حیدر آباد میں ناظم سررشتہ علوم و فنون کے عہدہ پر فائز تھے اور ندوہ آنے کا منصوبہ بنا رہے تھے، یہاں ان کی ادارت میں ندوہ کا ترجمان ماہنامہ الندوہ جاری ہو چکا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ مولانا آزاد ماہنامہ الندوہ سے وابستہ ہو جائیں۔ چنانچہ اس کے لئے انھوں نے مولانا آزاد پر دباؤ ڈالا اور وہ راضی ہو گئے۔ مولانا آزاد ندوہ لکھنؤ آئے تو معلوم ہوا کہ علامہ شبلی کی اہلیہ علیل ہیں اور وہ اعظم گڑھ گئے ہوئے ہیں اور یہ پیغام دیا ہے کہ مولانا آزاد لکھنؤ آئیں تو انھیں اعظم گڑھ بھیج دیا جائے۔ چنانچہ مولانا آزاد لکھنؤ سے اعظم گڑھ چلے آئے۔ یہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ علامہ شبلی کی اہلیہ انتقال کر گئی ہیں۔ ان کی تدفین کے بعد دونوں ساتھ ہی لکھنؤ واپس ہوئے اور پھر مولانا آزاد کئی ماہ الندوہ میں نائب ایڈیٹر کی حیثیت سے لکھنؤ میں مقیم رہے اور علامہ شبلی کی زیر نگرانی الندوہ کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ یہاں دونوں کے مراسم میں مزید گہرائی و گیرائی پیدا ہو گئی جو زندگی بھر باقی رہی بلکہ دن بہ دن اس میں مزید استحکام پیدا ہوتا گیا۔

الندوہ کے بعد مولانا آزاد وکیل امرت سر چلے گئے اور پھر کئی سال بعد مشہور اخبار الہلال جاری کیا۔ علامہ شبلی اس سے بہت متاثر ہوئے۔ انھیں ایک خط میں لکھا کہ:

”آپ نے (الہلال کا) بہت اونچا نصب العین رکھا ہے، ورنہ جی یہ چاہتا ہے کہ سب طرف سے نظر کر کے وہیں آرہتا اور آپ کے ساتھ مل کر کوئی ضروری خدمت انجام دیتا۔ اس وقت مسلمان سخت پراگندہ اور پریشان خیال اور پریشان عمل ہو رہے ہیں۔ کسی خاص مرکز پر ان کو لانا ہے، ورنہ ہر طرف سے بھٹکتے بھٹکتے آخر بالکل برباد ہو جائیں گے۔“ (مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۲۸۴)

ایک دوسرے خط میں لکھا کہ:

”الہلال نے احساس عام پیدا کر دیا ہے، یعنی تمام اسلامی کاموں

پر لوگوں کو مداخلت کا دعویٰ پیدا ہو گیا ہے۔ (ایضاً ص ۲۸۸)

اس دلچسپی کی بنا پر انھوں نے الہلال میں اپنی نگارشات اشاعت کے لئے بھیجیں اور مولانا آزاد انھیں بڑے اہتمام سے شائع کرتے رہے، اس میں فکارات کے تحت ان کی متعدد منظومات شائع ہوئیں جن کا تعلق قوم و ملت کے مختلف معاملات و مسائل سے ہے۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

”اس کے ادبیات و فکارات کے کالم میں سب سے زیادہ منظومات حضرت علامہ شبلی ہی کی چھپی ہیں۔ شائقین کوشبلی کی اسلامی، تاریخی یا وقت کے سیاسی مسائل پر مثلاً ہنگامہ طرابلس و بلقان کے موقع پر ”شہر آشوب اسلام“ جنگ کے زخمیوں کی خدمت اور ڈاکٹر انصاری کے میڈیکل مشن کی واپسی پر ان کا خیر مقدم، ہنگامہ مسجد کانپور، سوٹ اسٹیل گورنمنٹ، مسلم لیگ اور اس کے انداز فکر اور ذوق عمل، ترکوں کے آغا خاں کے مشورے، سید امیر علی سے خطاب، مسلم یونیورسٹی کے مسائل، یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے اجلاس، یونیورسٹی کے الحاق، اس کے ڈیپٹیشن، اس کے نصاب تعلیم، ندوۃ العلماء میں اختلاف کا فتنہ اور اس کے اطراف و متعلقات، جنگ یورپ ۱۹۱۴ء اور متعدد شخصیات جماعتوں وغیرہ پر ان کے ادبی و فکاہی رشحات فکر کا قارئین الہلال کو انتظار رہتا تھا۔ ان کی منظومات نے الہلال کو مقبول بنایا اور الہلال نے شبلی مرحوم کے افکار اور ان کے فیضان کو عام کیا، شبلی کی منظومات الہلال کی فکر و تحریک کا ایک حصہ تھیں۔“ (مضامین الندوہ ص ۱۰۴)

بنظر غائر دیکھا جائے تو علامہ شبلی کا آدھا اردو دیوان الہلال میں شائع ہوا ہے، اور وہیں سے سید صاحب نے اسے کلیات شبلی میں نقل کیا ہے۔ علامہ شبلی کی حریت فکر کے جو جذبات ان کے دیوان میں موجود ہیں، وہ سب الہلال کے صفحات پر جلوہ گر ہوئے۔ ایک نظم انھوں نے الہلال سے متعلق بھی کہی ہے جو الہلال ہی میں ”جزر و مد: الہلال کا لب و لہجہ“ کے عنوان سے شائع ہوئی ہے، اس سے واقعی الہلال کے لب و لہجے کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں نقل کی جاتی ہے۔

دیکھ کر حریت فکر کا یہ دور جدید سوچتا ہوں کہ یہ آئین خرد ہے کہ نہیں؟
 رہنماؤں کی یہ تحقیر یہ انداز کلام اس میں کچھ شائبہ رشک و حسد ہے کہ نہیں؟
 اعتراضات کا انبار جو آتا ہے نظر اس میں کچھ قابل تسلیم و سند ہے کہ نہیں؟
 نکتہ چینی کا یہ انداز، یہ آئین سخن بزم تہذیب میں یہ مستوجب رد ہے کہ نہیں؟
 جس نئی راہ میں بادیہ پیا ہیں یہ لوگ کوئی اس جادہ مشکل کا بلد ہے کہ نہیں؟
 شاطروں نے جوئی آج پچھائی ہے بساط اس میں ان پر بھی کہیں سے کوئی زد ہے کہ نہیں؟
 پہلے گر شان غلامی تھی تو اب خیرہ سری اس دورا ہے میں کوئی بیچ کی حد ہے کہ نہیں؟
 فیصلہ کرنے سے پہلے میں ذرا دیکھ تولوں

جزر جیسا تھا اسی زور کا مد ہے کہ نہیں؟

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے علامہ شبلی کی اس نظم کو الہلال کے تیس ان کا تذبذب قرار دیا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ نظم تذبذب نہیں بلکہ الہلال کے بلندلب و لہجہ اور مولانا آزاد کی فکر و نظر کی وسعت کی ایک ترجمانی ہے۔ دراصل الہلال نے صحافت کی جامد سطح کو جو بلندی عطا کی تھی یہ نظم اس کا ایک اظہار یہ ہے۔

الہلال کا جو زمانہ اشاعت (۱۹۱۲-۱۹۱۳ء) ہے وہ علامہ شبلی کی زندگی کے چند انتہائی اہم اور قابل ذکر معاملات و مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔ ان میں ایک سیرت نبویؐ کی تالیف و تدوین دوسرے ندوہ میں علامہ شبلی کی مخالفت، تیسرے دارالمصنفین کا قیام یہ تمام باتیں الہلال کے صفحات میں موجود ہیں اور ان موضوعات پر گراں قدر تحریریں اس کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہیں۔

سیرت النبیؐ علامہ شبلی کا آخری عظیم الشان کارنامہ ہے۔ اس کے سلسلے میں علامہ کے جن اہل علم اور ارباب کمال سے مشورہ ہوتے تھے، ان میں ایک اہم نام مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی ہے۔ مولانا آزاد نے اس کی تفصیل اپنی خودنوشت آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی میں جاہد جاکھی ہے۔

الہلال کے صفحات میں سیرت النبیؐ کا اولاً ذکر اس طرح آیا ہے کہ اس کا دیباچہ مولانا آزاد کے ایک نوٹ کے ساتھ چار قسطوں میں شائع ہوا ہے۔ یہ دیباچہ ۲۶ جنوری ۱۹۱۳ء (ص ۴۰) ۲۹ جنوری ۱۹۱۳ء (ص ۵۷) ۱۵ فروری ۱۹۱۳ء (ص ۷۳) ۱۹ فروری ۱۹۱۳ء (ص ۸۹) کو

الہلال میں شائع ہوا اور اس غرض سے شائع ہوا ہے کہ اہل علم دیکھ لیں کہ سیرۃ النبی کس بلند معیار پر لکھی جا رہی ہے۔ دیباچہ کی اشاعت کے بعد اس کی تعریف و تحسین میں تو کوئی مراسلہ شائع نہیں ہوا ہے۔ البتہ اعتراضات پر مشتمل دو مراسلے شائع ہوئے۔ پہلا مراسلہ ۳۱ اپریل ۱۹۱۳ء کو حکیم غلام غوث بہاول پوری کے قلم سے شائع ہوا، پھر دوسرا مراسلہ مولوی محمد اسحاق صاحب مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ کے قلم سے نکلا جو ۲۱ مئی ۱۹۱۳ء (ص ۳۰۲) و ۲۷ مئی ۱۹۱۳ء (ص ۲۶۶) کے شماروں میں شائع ہوا ہے، مولانا آزاد نے ان کا جواب بھی لکھا ہے۔ اس کے علاوہ سیرت سے متعلق کوئی تحریر الہلال میں نہیں ملتی۔

دارالمصنفین کا خیال علامہ شبلی کے دل میں عرصہ سے تھا۔ اس کا اظہار انھوں نے ۱۹۱۰ء میں ندوہ کے ایک اجلاس میں کیا تھا۔ وہ دارالمصنفین ندوہ میں قائم کرنا چاہتے تھے، مگر حالات ندوہ نے اس کا موقع نہیں دیا۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں جب وہ ندوہ سے مستعفی ہو کر اعظم گڑھ آئے اور اپنے وطن میں اس کو قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کا ایک مکمل خاکہ تیار کیا جسے مولانا آزاد نے الہلال میں ۱۱ فروری ۱۹۱۴ء (ص ۱۱۸) کو شائع کیا۔ چونکہ اس خاکہ کا ذکر کم آتا ہے، اس لئے یہ خاکہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

خدا کا شکر ہے کہ ملک میں تصنیف و تالیف کا مذاق پھیلنا جاتا ہے اور قابل قدر ارباب قلم پیدا ہوتے جاتے ہیں، لیکن بائیں ہمہ اس گروہ میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے، جن کو مصنف کے بجائے مضمون نگار یا انشاپرداز کہنا زیادہ موزوں ہوگا، کیوں کہ ان کی مستقل تصنیفیں نہیں ہیں بلکہ معمولی رسالے یا مضامین ہیں۔

اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کو اعلیٰ درجہ کی تصنیف کی قابلیت نہیں، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی تصنیف کے لیے جو سامان درکار ہے وہ مہیا نہیں ہے، ان میں سے اکثر کے پاس کتابوں کا ذخیرہ نہیں، جو انتخاب اور استنباط اور اقتباس کے کام آئے، اتفاق سے اگر کوئی مقامی کتب خانہ موجود ہے تو دلجمعی کے اسباب نہیں کہ اطمینان سے چند روز وہاں رہ کر کتابوں کا مطالعہ اور اس سے استفادہ اور نقل و انتخاب کر سکیں، ان باتوں کے ساتھ کوئی علمی مجمع بھی نہیں کہ ایک دوسرے سے

مشورہ اور مبادلہ خیالات ہو سکے۔

ان مشکلات کے حل اور تصنیف و تالیف کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ایک وسیع ”دارالتصنیف“ امور ذیل کے موافق قائم کیا جائے۔

۱- ایک عمدہ عمارت ”دارالتصنیف“ کے نام سے قائم کی جائے، جس میں ایک وسیع ہال کتب خانہ کے لیے ہو اور جس کے حوالی میں ان لوگوں کے قیام کے لیے کمرے ہوں، جو یہاں رہ کر کتب خانہ سے فائدہ اٹھانا اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہنا چاہتے ہوں۔

۲- یہ کمرے خوبصورت اور خوش وضع ہوں اور ان مشہور مصنفین کے نام سے موسوم ہوں، جو تصنیف کی کسی خاص شاخ کے موجد اور بانی فن ہوں۔

۳- ایک عمدہ کتب خانہ فراہم کیا جائے، جس میں کثرت تعداد ہی پر نظر نہ ہو بلکہ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ جس فن کی کتاب ہو، نادر اور کمیاب ہو۔

۴- تصنیفی وظائف قائم کیے جائیں اور وظیفہ عطا کنندہ کے نام سے موسوم کیا جائے، یہ وظائف یا ماہوار ہوں گے یا کسی تصنیف و تالیف کے صلہ کے طور پر دئے جائیں گے۔

۵- جو لوگ کم از کم پانچ سو روپیہ یک مشت عطا فرمائیں گے، ان کے نام اس عمارت پر کندہ کیے جائیں گے، میں یہ تجویز بالکل ایک سرسری صورت میں پیش کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ سر دست محض ایک خاکہ کے طور پر اس کی بنیاد قائم ہو جائے، جو رفتہ رفتہ خود بہ خود وسعت حاصل کرتی جائے گی، اس بات کا مجھ کو اطمینان ہے کہ ریاست ہائے اسلامی سے اس کے لیے ماہوار مقرر ہو سکیں گی، سر دست ہم کو صرف دس ہزار روپیہ درکار ہے، جس سے ایک مختصر تعمیر کی بنیاد ڈال دی جائے، اصل فنڈ کے لیے پچاس ہزار روپیہ کا تخمینہ کیا گیا ہے۔

۶- دس ہزار کی رقم میں میں سر دست ایک ہزار اپنا پیش کرتا ہوں اور میں اس بات کا بھی مستعدی ہوں کہ جن بزرگوں کو میری تجویز سے دلچسپی ہو، مجھ سے خط و کتابت فرمائیں اور مناسب مشورہ سے میری ہمت افزائی کریں، نیز ایڈیٹر ان ہمدرد، وطن، پیسہ اخبار، مشرق، البشیر، وکیل وغیرہ سے درخواست ہے کہ اس تجویز کو اپنے اپنے اخبار میں شائع فرمائیں۔

فقط شبلی نعمانی

(الہلال، ۱۱ فروری ۱۹۱۳ء)

اس کے علاوہ دارالمصنفین کے سلسلہ کی کوئی تفصیل الہلال میں درج نہیں ہے۔

ندوة العلماء سے علامہ شبلی کے گہرے مراسم، اختلافات اور اس سے متعلق مختلف قسم کے اعتراضات والزامات کا ایک دفتر الہلال میں شائع ہوا ہے۔ ندوہ کی اہمیت اور اختلافات سے ہونے والے نقصانات اور ندوہ کی تباہی و بربادی کے خدشات وغیرہ سے متعلق متعدد تحریروں الہلال میں شائع ہوئی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ندوہ کی تاریخ اس وقت تک مکمل ہی نہیں ہو سکتی جب تک الہلال کے صفحات و مندرجات سے بھرپور استفادہ نہ کیا جائے۔ ان کی تفصیل قلم بند کرنے کے بجائے یہاں ان کی ایک فہرست درج کی جاتی ہے:

- ۱- شمس العلماء مولانا شبلی اور مسئلہ الندوہ، ابوالکلام آزاد ۲۳ اپریل ۱۹۱۳ء۔ سرورق
- ۲- شمس العلماء مولانا شبلی اور مسئلہ الندوہ، ابوالکلام آزاد ۳۰ اپریل ۱۹۱۳ء۔ ص ۲۷
- ۳- شمس العلماء مولانا شبلی اور مسئلہ الندوہ، ابوالکلام آزاد ۷ مئی ۱۹۱۳ء۔ سرورق
- ۴- شمس العلماء مولانا شبلی اور مسئلہ الندوہ، ابوالکلام آزاد ۱۴ مئی ۱۹۱۳ء۔ سرورق
- ۵- شمس العلماء مولانا شبلی اور مسئلہ الندوہ، سید علی متقی امر وہ ۳۰ اپریل ۱۹۱۳ء۔ ص ۲۸۳
- ۶- علامہ شبلی نعمانی پر بے جا الزامات کی حقیقت۔ خواجہ رئیس الدین صاحب رئیس لکھنؤ۔

۱۲ مئی ۱۹۱۳ء۔ ص ۳۱۲

- ۷- مدارس اسلامیہ ندوة العلماء۔ ۲۱ جنوری ۱۹۱۳ء۔ ص ۴۱
- ۸- مدارس اسلامیہ ندوة العلماء۔ ۱۴ فروری ۱۹۱۳ء۔ ص ۸۶
- ۹- ایک فروگزاشت۔ اصلاح و تغیر۔ ۴ فروری ۱۹۱۳ء۔ ص ۸۴
- ۱۰- ندوة العلماء۔ اصلاح و تغیر۔ ۴ فروری ۱۹۱۳ء۔ ص ۸۶
- ۱۱- مدارس اسلامیہ۔ ندوة العلماء ماضی حال۔ ابوالکلام آزاد۔ ۴-۱۱ مارچ ۱۹۱۴ء۔ ص ۱۷۵
- ۱۲- آئندہ مباحث (ندوہ) //
- ۱۳- دوسری نظامت (ندوہ) //

- ۱۴- حیات بعد الممات (ندوہ) // //
- ۱۵- ایک عظیم الشان دینی تحریک کی انتہائی تخریب۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا خاتمہ، طلبائے مدرسہ کی اسٹرائٹک۔ ۱۴-۱۱/ مارچ ۱۹۱۴ء۔ ص ۱۷۲
- ۱۶- اسٹرائٹک۔ ۱۸/ مارچ ۱۹۱۴ء۔ سرورق
- ۱۷- اسٹرائٹک۔ ۱۸/ مارچ ۱۹۱۴ء۔ ص ۲۰۵
- ۱۸- خلاصہ مطالبہ۔ ۱۸/ مارچ ۱۹۱۴ء۔ ص ۲۰۵
- ۱۹- مدارس اسلامیہ ندوہ۔ ابوالکلام آزاد ۱۸/ مارچ ۱۹۱۴ء۔ ص ۲۰۹
- ۲۰- ندوۃ العلماء اور علامہ شبلی۔ شیخ احمد حسین۔ ۱۸/ مارچ ۱۹۱۴ء۔ ص ۲۲۰
- ۲۱- مدارس اسلامیہ ندوہ۔ ابوالکلام آزاد۔ ۹/ اپریل ۱۹۱۴ء۔ ص ۲۶۷
- ۲۲- مسئلہ بقا و اصلاح ندوہ۔ ۱/ اپریل ۱۹۱۴ء۔ ص ۲۶۷
- ۲۳- مسئلہ بقا و اصلاح ندوہ۔ ۸/ اپریل ۱۹۱۴ء۔ ص سرورق
- ۲۴- مولوی خلیل الرحمن۔ ۸/ اپریل ۱۹۱۴ء۔ ص ۲۸۰
- ۲۵- ندوہ کی قسمت کا فیصلہ۔ ۱۵-۲۲/ اپریل ۱۹۱۴ء۔ ص سرورق
- ۲۶- ریاست بھوپال اور ندوہ۔ ۱۵-۲۲/ اپریل ۱۹۱۴ء۔ ص ۳۰۵
- ۲۷- مولود فساد کا کامل بلوغ۔ ندوہ۔ ۱۵-۲۲/ اپریل ۱۹۱۴ء۔ ص ۳۰۳
- ۲۸- جلسہ انتظامیہ ۲۶/ مارچ۔ ۱۵-۲۲/ اپریل ۱۹۱۴ء۔ ص ۳۰۱
- ۲۹- مسئلہ بقا و اصلاح ندوہ۔ ۱۵-۱۸/ اپریل ۱۹۱۴ء۔ ص ۳۲۲
- ۳۰- انجمن اصلاح ندوہ تکمیل تخریب۔ ۱۵/ اپریل ۱۹۱۴ء۔ ص ۳۰۷
- ۳۱- مسئلہ ندوہ۔ ۲۹/ اپریل ۱۹۱۴ء۔ ص سرورق
- ۳۲- ریاست بھوپال اور مسئلہ ندوہ۔ ۲۹/ اپریل ۱۹۱۴ء۔ ص ۲۲۹
- ۳۳- مسئلہ بقا و اصلاح ندوہ۔ ۲۹/ اپریل ۱۹۱۴ء۔ ص ۳۲۸
- ۳۴- مولانا شبلی اور مسئلہ ندوہ۔ ۲۹/ اپریل ۱۹۱۴ء۔ ص ۳۳۰
- ۳۵- ندوہ کے متعلق ۱۰ مئی کا اجتماع۔ حکیم محمد اجمل خاں۔ ۲۹/ اپریل ۱۹۱۴ء۔ ص ۳۳۵

- ۳۶- مولانا عبدالسلام ندوی کا خط۔ ۲۹/اپریل ۱۹۱۴ء۔ ص ۳۴۴
- ۳۷- مسئلہ بقاء و اصلاح ندوہ۔ از ابوالکلام آزاد۔ ۶ مئی ۱۹۱۴ء۔ ص ۳۸۰
- ۳۸- جلسہ دہلی ۱۰ مئی کی رپورٹ۔ ۱۳-۲۰ مئی ۱۹۱۴ء۔ ص ۳۸۹
- ۳۹- ۱۰ مئی کا جلسہ دہلی۔ ۱۲-۲۰ مئی ۱۹۱۴ء۔ ص ۳۹۴
- ۴۰- مدارس اسلامیہ ۱۰ مئی سے پہلے اور اس کے بعد۔ ۲۷ مئی ۱۹۱۴ء۔ ص ۳۸۲
- ۴۱- ۱۰ مئی کا جلسہ۔ حکیم محمد اجمل خاں۔ ۲۴/جون ۱۹۱۴ء۔ ص ۴۶۳

مذکورہ تمام مضامین و مقالات اور مراسلات میں ندوہ اور اس کے اختلافات کا تفصیل سے ذکر ہے۔ اختلاف کرنے والوں اور ان کے درمیان مصالح کی کوششوں کی بھی تفصیلات ہیں۔ غرض ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۴ء میں ندوہ میں اختلاف و انتشار مصالح اور طلبہ کی اسٹرائٹک اور پھر صلح وغیرہ کے جلسہ میں ندوہ کے ہمدردوں اور مخلصین نے جو کوششیں کیں اور بقاء و اصلاح ندوہ کے لئے مولانا آزاد وغیرہ نے جو رائے دیں اور جو مفید مشورے دیئے اس کی ایک ایک تفصیل الہلال کے صفحات میں موجود ہے۔

اشتہار

الہلال میں کتابوں کے اشتہار بھی شائع ہوتے تھے۔ اس ضمن میں علامہ شبلی کی کئی کتابوں کے اشتہار شائع ہوئے ہیں۔ خاص طور پر الفاروق کا کئی جگہ اشتہار ہے۔ علمی ذخیرہ کے عنوان سے متعدد نادر و نایاب کتابوں کا بھی اشتہار الہلال میں چھپتا تھا۔ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد کا ایک اشتہار خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس نے آزاد بلگرامی کی دو نایاب کتابیں شائع کیں تو اس کا اشتہار علامہ شبلی کے قلم سے نکلا۔ چونکہ یہ علامہ شبلی کی ایک نادر تحریر ہے اور ان کے مقالات کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں، اس لئے یہاں نقل کی جاتی ہے۔

مولوی غلام علی آزاد بلگرامی کی دو نایاب کتابیں

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی ان وسیع النظر محققین میں سے ہیں کہ ان کے ہاتھ کی دو

سطریں ہات آجاتی ہیں تو اہل نظر آنکھوں سے لگاتے ہیں کہ ذخیرہ معلومات میں قابل قدر اضافہ ہو گیا۔ اہل ملک کی خوش قسمتی ہے کہ مولوی عبداللہ خاں صاحب [کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد] کی کوششوں سے ان کی تصنیفات سے دوہائیت اعلیٰ درجہ کی تصنیفیں آج کل شائع ہوئی ہیں۔ سروآزاد اور مآثر الکرام۔ سروآزاد خاص شعرائے متاخرین کا تذکرہ ہے۔ یہ تذکرہ جامعیت حالات کے ساتھ یہ خصوصیت بھی رکھتا ہے کہ اس میں جو انتخابی اشعار ہیں اعلیٰ درجہ کے ہیں۔ ورنہ آزاد کے متعلق یہ عام شکایت ہے کہ ان کا مذاق شاعری صحیح نہیں اور خزانہ عامرہ اور ید بیضا میں انہوں نے اساتذہ کا جو کلام انتخاباً نقل کیا ہے، اکثر ادنیٰ درجہ کے اشعار ہیں۔

مآثر الکرام میں ان حضرات صوفیہ کے حالات ہیں جو ابتدائے عہد اسلام سے اخیر زمانہ مصنف تک ہندوستان میں پیدا ہوئے۔

دونوں کتابوں میں عام حالات کے ذیل میں ایسے مفید اور نادر معلومات ہیں جو ہزاروں اوراق کے الٹنے سے بھی ہات نہیں آسکتیں۔ میں آزاد کی روح سے شرمندہ ہوں کہ علالت اور ضعف کی وجہ سے ان کی نادر تصانیف کے ریویو کا حق ادا نہ کر سکا اور صرف چند اشتہاری جملوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ شائقین فن شوق خریداری کا ثبوت دے کر ان کی روح سے شرمندہ نہ ہوں گے۔ قیمت ہر دو حصہ حسب ذیل ہے:

مآثر الکرام، ۳۳۴ صفحات، قیمت ۲ روپے، علاوہ محصول ڈاک

سروآزاد، ۴۲۲ صفحات، قیمت ۳ روپے، علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ:

عبداللہ خاں صاحب: کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن

[الہلال، ۲۸، جنوری ۱۹۱۴ء، ص ۷۳]

علامہ شبلی کی ایک نادر تصویر

علامہ شبلی کی تصویروں پر اب تک کوئی مضمون شائع نہیں ہوا ہے، حالانکہ اس کی ضرورت ہے۔ ان کی متعدد تصویریں ہیں جن کی وضاحت ہونی چاہئے کہ وہ کن مواقع کی ہیں۔

ان کی سب سے مشہور تصویر وہ ہے جو عطیہ فیضی کے شوہر مسٹر حمین فیضی نے بنائی تھی اور جو فرانس کی ایک نمائش میں انتخاب کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک تصویر ان کے زمانہ شباب کی ہے جو اعظم گرڈھ گزیئر میں شائع ہوئی تھی، یہ ان کی سب سے قدیم تصویر ہے۔ اسے جناب سید صباح الدین عبدالرحمن (۱۹۱۱ء-۱۹۸۷ء) نے انلارج کرا کے دارالمصنفین کے میوزیم میں محفوظ کر دیا تھا۔ ان کی آخری تصویر جو راقم الحروف کو دستیاب ہوئی تھی جس میں ان کے چچا شیخ مجیب اللہ، صاحبزادے حامد حسن نعمانی اور چچا زاد بھائی محمد عثمان وغیرہ موجود ہیں اور جوان کے مکان واقع الہ آباد میں لی گئی تھی میری کتاب شبلی کے نام اہل علم کے خطوط میں شائع ہو گئی ہے۔ الہلال میں ایک اور نادر تصویر شائع ہوئی ہے جس میں ان کے ساتھ السید محمد توفیق بے نائب فضل عثمانیہ بمبئی ساتھ میں ایستادہ ہیں۔ یہ نایاب تصویر الہلال کے ۲۴ دسمبر ۱۹۱۴ء (ص ۳۸۲) کے شمارہ میں شائع ہوئی ہے۔

تعطیل جمعہ

تعطیل جمعہ کے لئے علامہ شبلی کی جدوجہد ان کے قومی کاموں میں ایک اہم کام ہے، اس کے لئے انھوں نے ایک بڑی تحریک چلائی تھی، اس سلسلے میں انھوں نے اخبارات میں جو مراسلے لکھے تھے اور جو زمیندار وغیرہ میں شائع ہوئے تھے، وہی مراسلہ الہلال میں بھی شائع ہوا ہے۔ جس کا ذکر زمیندار کے ضمن میں آچکا ہے۔

وفات

الہلال میں علامہ شبلی کا آخری ذکر ان کی وفات کے حوالہ سے ہے۔ ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو انہوں نے وفات پائی اور الہلال کا آخری شمارہ بھی ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء ہی کو شائع ہوا۔ مولانا آزاد نے علامہ شبلی کی وفات کو حادثہ فاجعہ علمیہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے:

وماکان شبلی ہلکہ ہلک واحد

ولکنہ بنیان علم تہدما!

نہایت رنج و افسوس کے ساتھ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کے حادثہ وفات کی خبر درج

کی جاتی ہے۔ اس ماتم کے لئے صرف یہ مرقع رنج و غم کافی نہیں، اس کے لئے تو الہلال کا ایک پورا نمبر بھی کافی نہ ہوتا، لیکن اس وقت تو یہ رونا ہے کہ ہم دل کھول کر اس شہید علم کا ماتم بھی نہیں کر سکتے، اس لئے اپنی خوں نابہ فشانوں کو دوسری فرصت کے لئے ملتوی رکھتے ہیں۔ درد رسیدوں کے ماتم کے لئے کوئی وقت محدود نہیں، آبلہ دل ہر وقت پھوٹ بہنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ نشتر غم کی کھٹک چاہئے اور وہ اس حادثہ فاجعہ علمیہ کی بدولت دل میں ہر وقت موجود رہے گی۔ (الہلال کلکتہ ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء ص ۱۷)

غرض علامہ شبلی کی زندگی اور سوانح کے بہت سے واقعات الہلال کے صفحات میں محفوظ ہیں، بلاشبہ حیات شبلی لکھتے وقت مولانا سید سلیمان ندوی نے الہلال کے صفحات سے استفادہ کیا ہے اور بہت سے واقعات لکھے ہیں تاہم اب بھی بہت سی ایسی باتیں الہلال کے اوراق میں پوشیدہ ہیں جن کے گہرائی سے مطالعہ و جائزہ کی ضرورت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سوانح شبلی اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ الہلال میں محفوظ سوانح شبلی کے واقعات سے بھرپور استفادہ نہ کیا جائے۔ خاص طور پر اختلافات ندوہ کے سلسلے میں سب سے زیادہ تفصیل الہلال ہی کے صفحات میں موجود ہے۔

علامہ شبلی اور البلاغ

الہلال کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے البلاغ جاری کیا۔ یہ الہلال کی جگہ تو نہ لے سکا تاہم کافی اہم رسالہ تھا اور جب تک نکلا مقبول رہا۔ البلاغ علامہ شبلی کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ اس لئے فطری طور پر یہ خیال بھی نہیں آ سکتا کہ اس میں علامہ شبلی کا ذکر بھی ہوگا لیکن مولانا آزاد اپنے ممدوح کا ذکر کسی نہ کسی بہانہ سے ضرور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی متعدد تصنیفات و رسائل میں علامہ شبلی کا ذکر ملتا ہے۔ غبار خاطر ہو یا کاروان خیال، تذکرہ یا تفسیر، آزاد کی کہانی ہو یا الہلال و البلاغ۔ ہر جگہ کسی نہ کسی نوع سے علامہ شبلی کا ذکر ملتا ہے۔ البلاغ میں علامہ شبلی کا ذکر اس نوع سے ملتا ہے کہ ان کی وفات کے بعد کلکتہ کے مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس کی صدارت سید حسن امام نے کی تھی اور جس کا عنوان تھا ”مرحوم علامہ شبلی کی حیات علمی“۔ مولانا آزاد نے اس عنوان سے ایک مفصل تقریر کی تھی جسے مولوی محمد یعقوب صاحب نے نقل کر لیا تھا اور اسے مولانا آزاد کی خدمت میں اس غرض سے پیش کیا تھا کہ وہ اس پر نظر ثانی کر لیں اور دیکھ لیں کہ کہیں مطالب میں کوئی فرق تو واقع نہیں ہوا ہے۔ مولانا آزاد نے یہ تحریر اپنے پاس رکھ لی اور پھر ان کے ذہن سے نکل گئی۔ چنانچہ ایک سال بعد کچھ کاغذات کی تلاش میں جب وہ تحریر ملی تو اسے البلاغ میں شائع کیا۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں:

آج ایک سال کے بعد ایک ضرورت سے کاغذات کو دیکھنے لگا تو یہ پورا مضمون نکل آیا۔ مضمون نے پہلے سال گزشتہ کا وہ زمانہ یاد دلایا جب میں نے ان کاغذات کو حوالہ نسیاں کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی مولانا شبلی مرحوم اور ان کی ناقابل فراموش علمی و ادبی صحبتیں یاد آ گئیں۔

جرت الریاح علی مکان دیار ہم

فكانهم كانوا على ميعاد!

اگرچہ یہ ایک محض زبانی اور سرسری تقریر تھی اور پھر اس کے بھی نامکمل و متفرق نوٹ ہیں، تاہم خیال آیا کہ گذشتہ کی ہر یاد اور رفتہ کا ہر تذکرہ کچھ نہ کچھ دلچسپی ضرور رکھتا ہے۔ اسے شائع کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ ممکن ہے اس کے سرسری اشارات سے کوئی مفید بات کسی کو معلوم ہو جائے اور پھر تذکرہ علم و ادب علم بہ ہر حال عدم تذکرہ سے بہتر ہے۔“

(البلاغ گلکشتہ: ۷۷ و ۲۲ دسمبر ۱۹۱۵ء ص ۱۱۳)

مولانا ابوالکلام آزاد علامہ شبلی کے بہت بڑے مداح تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں ان کی عظمت کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے۔ مذکورہ تقریر میں بھی انھوں نے علامہ شبلی کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

ذیل میں اس تقریر کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ اس تقریر میں انھوں نے کس زاویہ سے علامہ شبلی کی تحسین فرمائی ہے۔

(۱)

میں اس مؤثر اور عظیم الشان اجتماع پر اس ہال کو مبارک باد دیتا ہوں اس لئے نہیں کہ انسانوں کا ایک بہت بڑا مجمع مجھے اپنے ارد گرد نظر آتا ہے، کیوں کہ جامع ہمیشہ ہوتے ہیں اور ہمیشہ ہوں گے۔ اس لئے نہیں کہ شوق اور محویت کا ایک غیر معمولی اجتماع میرے سامنے ہے کیوں کہ میں نے اس سے بھی وسیع تر حلقہ ہائے محویت و ذوق دیکھے ہیں اور اس لئے بھی نہیں کہ ایک منتخب اور تعلیم یافتہ صحبت یہاں منعقد ہو گئی ہے کیوں کہ ایسا بار بار ہوا ہے اور یہ میرے لئے کوئی نئی چیز نہیں، مگر حضرات! صرف اس لئے کہ آج کا اجتماع ان تمام موجبات تبریک سے بڑھ کر ایک خصوصیت اپنے اندر رکھتا ہے اور وہ کسی متدن اور زندہ اجتماع کے لئے سب سے بڑی عظمت ہے جو دنیا میں حاصل ہو سکتی ہے۔ ہمارا آج کا اجتماع طاقت کے ماتم میں نہیں ہے جس کا ماتم ہمیشہ کہا جاتا ہے۔ ہمارا ماتم دنیوی عزتوں کے لئے نہیں ہے جس پر حلقہ بگوشان دنیا نے ہمیشہ سینہ کوبی کی ہے۔ ہم کو

کسی دنیوی عز و جاہ کی کشش کھینچ کر یہاں نہیں لائی ہے۔ جس کی طاقت ور زنجیروں نے ہمیشہ بندہ حوس انسانوں کو مقید کیا ہے۔ بلکہ آج ہم صرف علم اور فن کے ماتم کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں جس کی تقدیس سب سے بالاتر اور جس کی عظمت کے آگے دنیا کی بڑی سے بڑی قوت بھی نیچ ہے۔“

(۲)

ہم ایک ایسے انسان کے غم میں اشک بار ہیں جو ایک فقیر بے نوا تھا جس کو کسی طرح دنیوی عزت حاصل نہ تھی جو نہ کبھی بڑے بڑے ایوانوں میں رہا اور نہ چاندی سونے کے خزانے اپنے وارثوں کے لئے جمع کئے۔ البتہ اس نے دنیوی شہشاہوں کی جگہ چالیس سال تک سلطان علم کی خدمت گزاری۔ پس مبارک ہے وہ اجتماع جو علم اور ارباب علم کے لئے ہوا اور مبارک ہو تم کہ آج طاقت، حکومت، عزت اور دولت کی جگہ علم اور اہل علم کی عظمت کے لئے جمع ہوئے ہو!

(۳)

آپ اعلان پڑھ چکے ہیں کہ میرا موضوع ”مولانا شبلی کی حیات علمی و ادبی“ ہے، لیکن حیران ہوں کہ ڈیڑھ دو گھنٹے کی صحبت کے اندر ایک چہل سالہ علمی زندگی کے متعلق آپ کو کیا بتا سکتا ہوں، اس قسم کے علمی موضوعوں کے لئے بہت کافی وقت کی ضرورت ہے۔ ہمارے سامنے ایک ایسی زندگی ہے جو یکسر تصنیف و تالیف میں بسر ہوئی اور جس کی تصنیف و تالیف کا میدان نہایت وسیع تھا۔ اگر صرف ایک ہی فن کا تذکرہ ہوتا تو اس کے لئے بھی ایک مختصر صحبت کافی نہیں ہوتی۔ یہاں تو مختلف علوم کی تصنیفات و مباحث کے مسائل درپیش ہیں اور جن میں بعض ایسے علوم بھی ہیں جن کا ذوق باہم متضاد و مختلف ہے۔ انھوں نے ایک ہی زندگی میں ایک ہی وقت کے اندر تاریخ، سیرت، کلام، حدیث اور ادب و شعر کے متعلق تصنیفات مرتب کی ہیں۔“

(۴)

مولانا شبلی مرحوم کو اگر ہم ایک ہی وقت کے اندر مختلف علوم کے مطالعے میں منہمک پاتے

ہیں تو اس کی قدر شناسی سے انکار نہیں کرنا چاہئے۔ انھوں نے ایک ہی زندگی میں متعدد زندگیوں کے کام انجام دیئے۔ ان کی تصنیفات ان کے تعدد مذاق و تنوع مطالعہ کی شہادت دیتی ہیں۔ وہ ایک ہی وقت میں مورخ خلفا، مورخ ملوک، مورخ علوم اور پھر ادیب، انشا پرداز اور شاعر تھے۔ بارہا تم نے دیکھا ہوگا کہ تاریخ و کلام کی علمی صحبتوں سے اٹھ کر حسن و عشق کی شاعرانہ زمون میں نغمہ طراز ہیں اور ادب و شعر کی مجلسیں ان کی دقیقہ سنجیوں سے رونق پا رہی ہیں۔“

(البلاغ کلکتہ: شمارہ ۴ و ۴)

مورخہ ۱۷/۲۴ دسمبر ۱۹۱۵ء ص ۱۵-۱۳)

اس کے علاوہ البلاغ میں علامہ شبلی سے متعلق کوئی تحریر شائع نہیں ہوئی ہے۔

علامہ شبلی اور زمیندار

روزنامہ زمیندار لاہور سے علامہ شبلی کا بڑا گہرا تعلق تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ یہ اپنے وقت کا ایک مشہور اخبار ہی نہ تھا بلکہ اس کی حیثیت ایک تحریک کی تھی اور اس میں ملک و ملت کے مسائل پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ مسلمانان عالم کے مسائل و مشکلات پر بحث ہوتی تھی اور استعماری طاقتوں کے سازشوں کو بے نقاب کیا جاتا تھا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کے مالک اور مدیر مولانا ظفر علی خاں علامہ شبلی کے شاگرد تھے۔ انہوں نے علی گڑھ کالج میں ان سے فیض حاصل کیا تھا۔ ان اسباب سے علامہ شبلی اپنے مضامین اور نظمیں وغیرہ اشاعت کے لئے زمیندار میں بھیجا کرتے تھے اور زمیندار میں انھیں بڑے اہتمام سے شائع کیا جاتا تھا۔

زمیندار اب تقریباً ناپید ہے۔ البتہ بعض کتب خانوں میں اس کے کچھ شمارے دستیاب ہیں، مکمل فائل شاید کہیں دستیاب نہیں۔ گذشتہ دنوں مولانا غلام رسول مہر صاحب کے صاحبزادے جناب امجد سلیم علوی صاحب نے جن کے پاس زمیندار کی کچھ فائلیں محفوظ ہیں، میری گزارش پر اس کے چند صفحات عنایت فرمائے۔ اس کے علاوہ کچھ تحریریں مدرسۃ الاصلاح سرارے میر سے دستیاب ہوئیں۔ اس لئے خیال پیدا ہوا کہ اگر انہیں جمع کر دیا جائے تو یہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائیں گی، ورنہ دست برد زمانہ انھیں بھی خاک کر دے گا۔ چنانچہ اب تک جو تحریریں دریافت ہوئی ہیں انھیں زیر نظر مقالہ میں جمع کیا جا رہا ہے:

۱- مضامین

روزنامہ زمیندار میں یقیناً علامہ شبلی کے مضامین شائع ہوئے ہوں گے، مگر اس کے

جوشارے راقم کے پیش نظر ہیں ان میں علامہ شبلی کا کوئی مضمون شامل اشاعت نہیں ہے۔

۲- منظومات

زمیندار میں علامہ شبلی کی کتنی نظمیں شائع ہوئیں اس کی تفصیل زمیندار کے مکمل شماروں کی عدم دستیابی کی وجہ سے پیش نہیں کی جاسکتی، البتہ جوشارے دستیاب ہیں ان میں علامہ کی ایک مشہور نظم جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

اک جرمنی نے کہا از رہے غرور

آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں

۲۳ دسمبر ۱۹۱۲ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ یہ نظم مولوی معین الدین قدوائی نے اشاعت کے لئے بھیجی تھی۔ یہ نظم علامہ شبلی کی وفات کے بعد ان کے کاغذات میں ملی تھی جیسا کہ مولوی معین الدین قدوائی نے مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار کے نام اپنے خط میں تصریح کی ہے۔ اس نظم پر مولانا ظفر علی خاں نے جو نوٹ لکھا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ نظم علامہ شبلی کی وفات کے بعد پہلی بار زمیندار میں شائع ہوئی، اس کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی نے کلیات شبلی میں شامل کی۔ مولانا ظفر علی خاں نے لکھا ہے کہ:

”اگر خود علامہ شبلی اس نظم کو شائع کرتے تو ممکن تھا کہ اس کے اشعار کی تعداد

و ترتیب کچھ اور ہوتی اور وہ بہت کچھ ترمیم و اضافہ سے کام لیتے۔ علامہ شبلی کا

غیر مطبوعہ کلام خواہ وہ کیسا ہی مختصر اور ادھورا ہو، ہمارے لئے موجودہ صورت میں تبرک

سے کم نہیں۔ ہم مولوی معین الدین احمد صاحب کے سپاس گزار ہیں کہ انھوں نے

مندرجہ بالا اشعار زمیندار میں بغرض اشاعت روانہ فرمائے۔“

(زمیندار لاہور ۲۳ دسمبر ۱۹۱۲ء)

۳- مراسلات

روزنامہ زمیندار میں علامہ شبلی کے متعدد مراسلات شائع ہوئے ہیں، ان کی تفصیل یہ

ہے:

- ۱- تعطیل جمعہ: ۱۰/۱۰ اپریل ۱۹۱۳ء
- ۲- حرم محترم میں جامعہ اسلامیہ (یونیورسٹی) کی تجویز: ۱۵/۱۰ اپریل ۱۹۱۳ء
- ۳- مولوی عبدالکریم کی معطلی: ۱۰/۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ
- ۴- مدینہ یونیورسٹی کا نصاب تعلیم: ۲۲/۱۰ مئی ۱۹۱۳ء
- ۵- جلسہ دہلی کے متعلق ایک عام غلط فہمی کی تردید: ۲۰ مئی ۱۹۱۴ء

پہلا مراسلہ: تعطیل جمعہ

سرکاری دفاتر میں نماز جمعہ کی ادائیگی کے لئے تعطیل نہیں ہوتی تھی جس سے مسلمان ملازمین کو نماز جمعہ ادا کرنے میں دشواری ہوتی تھی۔ علامہ شبلی نے تعطیل جمعہ کے لئے بڑے پیمانہ پر تحریک چلائی۔ اس دوران بنگال کونسل میں تعطیل جمعہ کے لئے دو گھنٹہ کی رخصت کی تجویز منظور ہوئی۔ اس تجویز کے پس منظر میں علامہ شبلی نے روزنامہ زمیندار میں مراسلہ لکھا جو یہ ہے:

مسٹر غزنوی کے سوال کا گورنمنٹ کی طرف سے جو جواب دیا گیا اس کے بعد تعطیل جمعہ (نصف روز) کی ضرورت ہے یا نہیں؟

مسلمان ایک مدت سے اس بات کو محسوس کرتے تھے کہ جمعہ کے دن سرکاری عداالتوں کے کھلے رہنے سے مسلمان ملازموں کو عملاً ایک فرض مذہبی کے ادا کرنے سے باز رہنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ایک دو سال سے اس کے متعلق مسلمانوں نے کوشش شروع کی۔ مسٹر غزنوی کی تحریک و سعی سے گورنمنٹ بنگال نے دو گھنٹہ کی چھٹی منظور کی، حال میں مسٹر غزنوی کے سوال پر گورنمنٹ ممبر نے کونسل میں کہا کہ گورنمنٹ بخوشی اس بات کو منظور کرے گی کہ جو مسلمان ملازم جمعہ کو نماز ادا کرنے کے لئے چھٹی طلب کرے اس کو اجازت دی جائے۔

اس کارروائی سے بعضوں کو یہ اطمینان ہو گیا ہے کہ اب جمعہ کی تعطیل (نصف روز) کی تحریک کی ضرورت نہیں رہی لیکن بہت سے لوگ ایسے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ

اس کارروائی نے اصل مسئلہ کو حل نہیں کیا۔

گورنمنٹ کی طرف سے جو جواب دیا گیا ہے اس کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان اپنے افسر سے جمعہ کے دن نماز کے لئے چھٹی طلب کرے وہ اس کو چھٹی دیدے گا، لیکن یہ اجازت اور دو گھنٹہ کی عام تعطیل دو مختلف باتیں ہیں۔ اجازت کے حکم کا منشا یہ ہے کہ ہر ملازم کو ہر دفعہ جمعہ کے دن اجازت طلب کرنی پڑے گی۔ اس صورت میں یہ ظاہر ہے کہ خاص خاص حالات میں اکثر ملازموں کو خود اجازت طلب کرنے میں تامل ہوگا۔ مثلاً جب وہ دیکھے گا کہ اس کا افسر مسلمان نہیں ہے اور اس کو کسی قسم کی مذہبی پابندی کی بہ نسبت دفتر کے کام پورا ہونے کا زیادہ لحاظ ہوگا۔ اس صورت میں گوملازم کو یہ یقین ہوگا کہ اجازت بہر حال مل جائے گی تاہم اس کو بار بار اجازت طلب کرنے میں پھر بھی تامل ہوگا، بخلاف اس کے اگر یہ معلوم ہو کہ مسلمانوں کو جمعہ کے دن عام اجازت ہے تو بے تکلف ہر شخص اس اجازت سے مستفیض ہو سکے گا۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کی اصلی خواہش یہ ہے کہ یہ دو گھنٹہ کی چھٹی مسلمان ملازموں کے ساتھ مخصوص نہ رہے گی بلکہ عام طور پر جمعہ کے دن آدھے دن کی تعطیل دیدی جائے۔ اس لئے کہ اگر یہ تعطیل مسلمانوں کے ساتھ مخصوص رہی تو مسلمان ملازموں کو یہ اندیشہ رہے گا کہ غیر مسلمان افسر ہمیشہ مسلمان ملازموں کو اپنی ماتحتی میں لینا پسند نہ کریں گے کیوں کہ ان کو ہمیشہ یہ نظر آئے گا کہ ہر آٹھویں دن ایسے ملازموں کی وجہ سے سرکاری کاموں کے انجام دینے میں دو گھنٹے ضائع ہو جاتے ہیں۔

ان وجوہ کی بنا پر ہم تمام اسلامی اخبارات اور اہل الرائے حضرات سے متدعی ہیں کہ وہ بہ تفصیل و توضیح اس امر کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کریں۔ کیا گورنمنٹ کی معرفت اور محتاج اعادہ اجازت پر قناعت کرنی چاہئے یا عام تعطیل کی درخواست کرنی چاہئے اور یہ کہ اس پر اکتفا کرنا چاہئے کہ یہ نصف روزہ تعطیل مسلمانوں کے ساتھ مخصوص رہے یا عام کر دی جائے۔

شبلی نعمانی

(روزنامہ زمیندار۔ ۱۰ اپریل ۱۹۱۳ء)

علامہ شبلی کے اس مراسلے پر زمیندار میں یقینی طور پر بحث ہوئی مگر ایک مراسلہ کے سوا کوئی تفصیل دستیاب نہیں ہے۔ یہ مراسلہ حکیم سید محمد عسکری نے کانپور سے لکھا ہے اور محتاج اعادہ اجازت کے بجائے عام رخصت کی تائید کی ہے۔ مراسلہ یہ ہے:

تعطیل جمعہ

متذکرہ صدر عنوان سے بنس العلامہ مولانا شبلی نعمانی نے جو تحریک بغرض حصول آراء زمیندار مطبوعہ ۱۰ اپریل ۱۹۱۳ء میں شائع کی ہے اس کے تحت حسب ذیل عرض ہے:

ہمارے نزدیک کسی موقت اور محتاج الاعادہ اجازت پر کفایت کرنا ہرگز قرین مصلحت نہیں کیوں کہ اس صورت میں جو ممکن الوقوع خدشات و ترددات ناگزیر سمجھے گئے ہیں بدستور قائم رہیں گے اور درحقیقت مسلمانوں کو عام طور پر آزادی کے ساتھ ایسی اجازت سے بلا تکلف مستفیض ہونے کی بہت کم توقع ہے گو کونسل میں مسٹر غزنوی کے سوال پر روشن خیال گورنمنٹ ممبر کے حسب ذیل الفاظ کہ ”گورنمنٹ بخوشی اس بات کو منظور کرے گی کہ جو مسلمان ملازم جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لئے چھٹی طلب کرے اس کو اجازت دی جائے۔“ مسلمانوں کے لئے ہر طرح موجب اعتنائ ہیں اور مسلمانوں کو اپنی رحم دل گورنمنٹ سے اپنی ہر جائز اور پر عدل گستری کی اس سے بڑھ کر کیا امید ہے مگر وہ مجبور ہیں کہ ان کے تجربے اور مشاہدے اور بعض ارکان حکومت کے تعصبانہ برتاؤ اس مسئلہ میں ان کے مرکز اطمینان کو غیر معمولی حد تک مذہب اور منزل زل کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہم نے جس حد تک غور کیا ہے اور نیز ہمیں جہاں تک اپنے معزز احباب کی خدمت میں استصواب آرا کا موقع ملا ہے، سب کے سب بالاتفاق اسی شق کے موید پائے گئے کہ مسلمانوں کی

جانب سے اس موقع پر عام تعطیل کی درخواست ہونی چاہئے اور یہ نصف روزہ تعطیل
حق الامکان بلا تخصیص قوم و ملت تمام ملازموں کے حق میں جاری رہنی چاہئے۔

حکیم سید محمد عسکری

از پکا پور، کان پور

دوسرا مراسلہ: حرم محترم میں جامعہ اسلامیہ (یونیورسٹی) کی تجویز

علامہ شبلی نے حرم محترم مکہ میں ایک اسلامی یونیورسٹی کی تجویز روزنامہ زمیندار
۱۵ اپریل ۱۹۱۳ء میں پیش کی تھی۔ یہ ایک بے حد اہم اطلاع ہے اس لئے کہ اس تجویز کا ذکر ان کی
مفصل سوانح عمری حیات شبلی میں بھی نہیں ہے۔ صرف زمیندار کے صفحات سے اس کا انکشاف
ہوتا ہے۔ علامہ شبلی کے الفاظ میں تجویز یہ ہے:

واقعات حال نے ایک ایک شخص کو آنکھوں سے دکھا دیا کہ اسلام
(یعنی مسلمان) آفتاب لب بام ہو رہا ہے اور اگر عام مسلمان اپنی تمام قوت
ایک اجتماعی صورت میں صرف نہ کریں گے تو اب ان کی بقا کی امید نہیں۔ یہ
خیال عام ہوتا جاتا ہے کہ لیکن افسوس ہے کہ تدبیر میں اختلاف ہے اور کوئی
خاص مشترک رائے نہیں قائم ہوتی۔

میرے نزدیک سب سے مقدم تجویز یہ ہے کہ مکہ معظمہ میں ایک
جامعہ اسلامیہ قائم کی جائے جس میں تمام مذہبی اور دنیوی (جن میں علوم
جدیدہ بھی شامل ہیں) علوم کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہو۔

یہ ظاہر ہے کہ آج کل ہر قسم کی قوت علم پر موقوف ہے اور دراصل علم
ہی اصلی طاقت ہے۔ اس لئے آج کل ہر قوم کی بقا اسی پر موقوف ہے کہ وہ
تمام علوم و فنون میں کامل ہو۔

مکہ معظمہ میں جامعہ اسلامیہ کے قائم کرنے کی ترجیح کی متعدد وجوہ

ہیں:

۱- مکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا مرکز ہے اور ہر ملک کے مسلمان بہ شوق و رغبت وہاں تعلیم حاصل کرنے کے لئے جاسکتے ہیں۔ مصر یا قسطنطنیہ یا کسی اور مقام میں یہ کوشش نہیں ہو سکتی۔

۲- جس قدر سرمایہ کثیر مکہ معظمہ کی جامعہ کے لئے مہیا ہے اور کسی مقام کے لئے نہیں ہو سکتا۔

۳- ہر سال حجاج سے اگر صرف ایک روپے فی کس وصول ہو تو لاکھوں کی رقم وصول ہو سکتی ہے۔

۴- مکہ معظمہ میں نہایت عمدہ کتب خانہ موجود ہے۔

۵- مکہ معظمہ سے قریب طائف نہایت سرد اور خوش گوار مقام ہے اور گرمیوں کے زمانہ میں طلبہ اور اساتذہ وہاں بسر کر سکتے ہیں۔

۶- بڑا مقصد اس تجویز سے یہ حاصل ہوگا کہ عرب کے تمام قبائل جو ہزاروں برس سے اب تک جاہل رہتے آئے ہیں ان میں تعلیم پھیلے گی اور اس غرض کے لئے مختلف بڑے بڑے قبائل میں جامعہ اسلامیہ کی شاخیں قائم کی جائیں گی۔ اعراب اور بدوؤں کو وظائف کے ذریعہ سے علم کی ترغیب بہ آسانی ہو سکتی ہے۔

اس کام میں کسی قدر دقت یہ ہے کہ ترکی کی گورنمنٹ مشکل سے اس کی اجازت دے گی کیوں کہ ترکوں نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ عربوں میں علم و تہذیب پھیلنے پائے۔ چنانچہ بڑے بڑے صدر مقامات عرب میں ایک بھی بڑا سرکاری مدرسہ نہیں، لیکن اب ترکوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں اور ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکوں پر اپنی جاں نثاری کے اتنے حقوق قائم کرائے ہیں کہ اگر تمام مسلمان متفقاً اس قسم کی درخواست ترکی سے کریں تو وہ انکار نہ کر سکے گا۔

یہ بھی ضرور ہے کہ اس تجویز کو کسی قسم کا پلٹکل رنگ نہ دیا جائے۔

یہ صرف ایک علمی تجویز ہے اور یوں تو آج کل ایک ایک بات یہاں تک کہ
آب وہو ابھی پوٹیکل بن گئی ہے۔ اس کا کہاں تک لحاظ کیا جاسکتا ہے۔

اگر یہ تجویز پسند کے قابل ہو تو سب سے پہلے اسلامی اخباروں
سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ تمام قوم کو اس کی طرف متوجہ کریں اور پھر بالخصوص
قومی درووالوں مثلاً آغا خاں صاحب، راجہ علی محمد خاں صاحب، نواب
صاحب ڈھاکہ، قزلباش خاں، نواب وقار الملک، آفتاب احمد خاں، مسٹر محمد
علی، ایڈیٹر صاحب الہلال سے استدعا کرتا ہوں کہ یہ کام آپ سے زیادہ
مفید اور سب سے زیادہ ممکن الحصول ہے۔

میں بہ اس ضعف و شکستہ پائی یہ کر سکتا ہوں کہ اس تحریک کے لئے
تمام ہندوستان کا دورہ کروں اور پھر ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلا جاؤں اور اس
مبارک جامعہ میں جاروب کشی کی خدمت انجام دوں۔

شبلی نعمانی

(روزنامہ زمیندار ۱۵ اپریل ۱۹۱۳ء)

علامہ شبلی کی اس تجویز اور ان کے مراسلہ پر متعدد اہل علم نے غور و خوض کیا اور روزنامہ
زمیندار میں مراسلے لکھے اور اپنے اپنے آراء و خیالات کا اظہار کیا۔ اس سلسلے کے جو مراسلات
دستیاب ہوئے اور پڑھے جاسکے انھیں افادیت کے پیش نظر یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

(۱)

جناب ایڈیٹر صاحب اخبار زمیندار لاہور

تسلیم۔ آپ کے اخبار مورخہ ۱۵ اپریل میں جامعہ اسلامیہ کے انعقاد کی تحریک دیکھ
کر بڑی خوشی ہوئی، درحقیقت اہل اسلام اور مسلمانوں کی بقا اسی بات پر منحصر ہے کہ مسلمان پنبہ
غفلت و کسلمندی کو گوش و ہوش سے نکال کر متفقہ ترقی تعلیم اور استحصال فنون اور معارف میں جہد
بلغ کریں۔ مولانا شبلی نعمانی کی طرح خاکسار بھی اس جامعہ کی جاروب کشی کے لئے مستعد اور طیار
ہے، بلکہ حیدرآباد سے جزم مدینہ طیبہ نکل چکا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ماہ جون کے آخر تک مدینہ

طیبہ پہنچ جائے گا۔ خاکسار کی رائے میں جامعہ اسلامیہ کا انعقاد بعض ملکہ معظمہ مدینہ طیبہ میں زیادہ مناسب اور موزوں ہے، کیوں کہ مکہ تک سلسلہ ریلوے نہیں ہے۔ مدینہ طیبہ تک ریل کا سلسلہ جاری ہے۔ دوسرے مکہ کی ہوا نہایت گرم ہے اور ایسی صحت خیر نہیں ہے جیسی مدینہ طیبہ کی ہے۔ تیسرے ترقی اسلام مدینہ طیبہ ہی سے شروع ہوئی تھی۔ اور اب بھی وہیں سے اس کی ابتدا ایک فال نیک ہے اور گویا ظہور ہے اس حدیث کا ان السلام لیاذر الی المدینۃ کما تاذر الحیۃ الی جحرھا۔

میں..... کہتا ہوں کہ اگر جناب مولوی ظفر علی خاں صاحب اور مسٹر محمد علی صاحب اور جناب مولوی ابوالکلام صاحب متفقہ کوشش اور سعی فرمائیں اور استخصال چندہ کے لئے ایک زبردست انجمن قائم کریں تو جامعہ اسلامیہ کا انعقاد مدینہ طیبہ میں بہت جلد شروع ہو جائے گا۔ اس جامعہ اسلامیہ کی غرض صرف ترقی علوم اور معارف..... و نشر فنون اور مدارک ہوگی۔ پولیٹیکل اور سیاسی امور سے اس کو کوئی واسطہ نہ ہوگا اور ایسی حالت میں نہ ہماری مہربان گورنمنٹ ہند کو نہ اور کسی دولت کو اعتراض ہوگا بلکہ امید ہے کہ گورنمنٹ ہند اور انگلینڈ خصوصاً ہمارے بادشاہ حضور قیصر ہند سب سے زیادہ ایسی تعلیم گاہ کے انعقاد میں مدد دیں گے۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

خاکسار وقار نواز جنگ از بنگلور

(۲)

ایڈیٹر صاحب زمیندار

السلام علیکم۔ آپ کے اخبار مطبوعہ ۱۵ اپریل میں شمس العلماء مولانا شبلی کا جو خط دربارہ جامعہ اسلامیہ شائع ہوا ہے، اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے میں یہ چند سطور بغرض اشاعت آپ کی خدمت میں روانہ کرتا ہوں۔

میرے نزدیک یہ فیصل شدہ مسئلہ ہے کہ بغیر ترقی تعلیم کے (جس میں علوم جدیدہ مغربی قطعاً شامل ہیں) مسلمان دنیا میں بحیثیت حکمران تو درکنار بطور معزز محکوم کے بھی نہیں رہ سکتے ہیں اور اس بنا پر میں ایک ایسی یونیورسٹی کی تحریک کا جیسی کہ جناب علامہ شبلی نے کی ہے بلا پس و پیش موید ہوں اور وہ دن ایک مسعود دن ہوگا جب کہ یہ تحریک عمل میں آجائے۔ ترکوں کے ملک میں

جب کہ مختلف ملکوں کی جیسا کہ فن تعلیم کی ترقی کا کام کر رہے ہیں تو کسی ہندوستانی مسلم مشن کا بھی ان کے ملک میں کام کرنا انوکھا کام نہ ہوگا۔ اور غالباً ترکی گورنمنٹ اس تحریک کو قبول کرے گی لیکن چونکہ مسلمانوں کے کام باقاعدہ سرانجام نہیں پایا کرتے ہیں جس کی مثال ندوۃ العلماء اور مسلم یونیورسٹی موجود ہیں اس واسطے یہ یقین کرنا دشوار ہے کہ ہم لوگ بیرون ہند کوئی ایسا مہتمم بالشان کام کر سکتے ہیں؟

مگر میں نے اس سوال کا حل اس طور پر کیا ہے کہ اول یہ کام ہندوستانیوں کے روپیہ اور ترکی سلطنت کے اہتمام سے لیکن ہمارے ایک بورڈ کی نگرانی میں ہو۔ دوم بجائے مکہ مکرمہ کے جامعہ اسلامیہ جدہ میں قائم ہو۔ جدہ کے جنوبی سمت میں لب سمندر وسیع میدان اس کام کے واسطے موجود ہے اور میرا خیال ہے کہ آب شیریں کا منبع بھی اسی طرف ہے۔ جدہ میں قیام دارالتعلیم کی ضرورت اس وجہ سے بھی ہے کہ یونیورسٹی کا عمدہ انتظام اور مغربی تعلیم بغیر یورپین یا اجنبی (اجنبی سے مراد جاپانی یا امریکن ہیں) پرنسپل اور پروفیسروں کے ناممکن ہے۔ تمام دنیا کے مسلمان بلا استثناء انتظامی قابلیت کھو چکے ہیں، پس ہم جب تک یورپین یا اجانب کی نگرانی میں اپنا کام نہیں چلائیں گے ہمارے سب کام ابتر در ابتر رہیں گے۔ جدہ میں اس کے ہونے اور یورپین اور اجانب سے کام لینے کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارا یہ کام بدگمانی سے مبرا نہیں ہوگا۔ پس مکہ مکرمہ کو پہلے تو مرکز بدگمانی بنانا خلاف عقل ہے۔ دوسرے یورپین یا اجنبی پرنسپل اور پروفیسروں اور طلبہ میں سلاطین یورپ کے کونسل خانے ہونے سے اس سے بدگمانی نہیں ہو سکے گی۔

جیسا کہ مولانا شبلی نے لکھا ہے حاجیوں پر فی حاجی ایک روپیہ ٹکس لگانا چاہئے جس کو ترکی گورنمنٹ اس کام کے واسطے ہندوستانیوں کی نگرانی میں وصول اور خرچ کیا کرے اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ ترکی گورنمنٹ بھی مالی مدد کرے گی اور مختلف عطیے ملا کریں گے۔ مولانا شبلی کی مہاجرت اس کام کے واسطے مولانا کو یہیں رہ کر ندوۃ العلماء کی حالت درست کرنی چاہئے جس کی ضرورت باوجود ایک جامعہ اسلامیہ کے بھی باقی رہے گی۔

(نواب) حاجی محمد اسماعیل خاں

حرم محترم جامعہ اسلامیہ (یونیورسٹی) کی تجویز

اس عنوان سے ایک مضمون روزنامہ زمیندار ۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ (۱۵ اپریل ۱۹۱۳ء) میں منجانب حضرت شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی مدظلہ العالی شائع ہوا ہے۔ میں نے سال حال میں حج بیت اللہ شریف کے سلسلے میں مکہ مکرمہ کو دیکھا ہے اور وہاں کے حالات سے کسی قدر آگاہی حاصل کی ہے۔ اس بارہ میں اس اطلاع کو جو اس تجویز کے متعلق ضروری الاشاعت معلوم ہوتی ہے، عرض کرتا ہوں۔

سرزمین عرب میں ایسی تجویز کا احساس اس سے بہت پیشتر شروع ہو چکا ہے۔ چنانچہ مکہ مکرمہ اور جدہ شریف میں ایک مدرسہ مدرسۃ الفلاح کے نام سے قوم کے ایک دردخواہ نے کھول رکھا ہے۔ میں نے ان مدارس کے متعلق تمام معلومات حاصل کی ہیں اور خوش قسمتی سے حضرت مہتمم مدرسہ مذکور سے نیاز و شناسائی حاصل ہونے پر میں نے جدہ شریف کے مدرسۃ الفلاح کا ملا حظہ بھی کیا اور طریق تعلیم کو غور سے دیکھتا رہا۔ بعض جماعتوں کے مختلف متعلمین کی استعداد بھی میں نے دیکھی اس کے متعلق میں ایک مفصل چھٹی مسلم گزٹ لکھنؤ کو لکھنے والا ہوں۔ یقین ہے کہ حضرت مخدومی علامہ شبلی مدظلہ العالی کی نظر سے وہ اخبار عنقریب گزرے گا۔

لیکن اس قدر میں یہاں عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ جناب ممدوح نے اخبار زمیندار کے مضمون میں جو صورت ظاہر فرمائی ہے بالکل اسی بیجا نہ کو پیش نظر رکھ کر یہ دونوں مدارس کھولے گئے ہیں۔

اگرچہ جہاں تک مجھ کو علم ہے گرمیوں کے موسم میں طلبہ اور اساتذہ کے طائف جانے کا خیال ابھی تک وہاں نہیں پیدا ہوا۔ مدرسۃ الفلاح کی حالت جدہ اور مکہ مکرمہ میں ابھی تک ابتدائی ہے مگر

سائے کہ نکوست از بہارش پیدا ست

(یہ مراسلہ مکمل دریافت نہ ہو سکا اس لئے اسی حصہ کے نقل پر اکتفا کرنا پڑا)

(۴)

جناب ایڈیٹر صاحب اخبار زمیندار لاہور

تسلیم۔ آپ کے اخبار مطبوعہ ۲۰ جمادی الاول میں ایک خط کسی صاحب حاجی محمد

اسماعیل خاں نامی کا شائع ہوا ہے۔ اس خط میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ یقیناً ہر مسلمان کے لئے جو ذرا بھی دولت ایمان سے بہرہ ور ہے نہایت درجہ دل شکن ہیں۔ صاحب خط جامعہ اسلامیہ کی ضرورت اور اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے متعلق یوں گویا ہر افشانی فرماتے ہیں: ”لیکن چونکہ مسلمانوں کے کام باقاعدہ سرانجام نہیں پایا کرتے ہیں جس کی مثالیں ندوۃ العلماء اور مسلم یونیورسٹی موجود ہیں، اس واسطے یہ یقین کرنا دشوار ہے کہ ہم بیرون ہند کوئی ایسا مہتمم بالشان کام کر سکتے ہیں۔“ ہم نواب صاحب کو یقین دلاتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان اس تحریک کے موجود نہیں ہیں اور نہ ان کے سپرد جامعہ اسلامیہ کا انتظام رہے گا۔ یہ تحریک ترکوں کی ہے اور برادران ترک ہی اسے پایہ تکمیل کو پہنچائیں گے۔ ہندوستان کے مسلمان کیا تمام دنیائے اسلام کے مسلمان اس سرچشمہ علم کے اجرا میں کوشش کرنا اپنا مقدس فرض سمجھیں گے۔ نواب صاحب پھر تحریر فرماتے ہیں کہ ”مسلمان بلا استثناء انتظامی قابلیت کھو چکے ہیں۔“ اس کو ہم بے شک ایک حد تک صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ جہاں تک ”انتظامی قابلیت“ کا تعلق ہندوستان کے امراء اور نوابوں تک ہے کیوں کہ ان میں یہ جوہر بالکل معدوم ہو چکا ہے۔ اور اسی لئے اس فرقہ پر یہ آسمانی وحی نازل ہوئی ہے: ”جب تک تم یورپین اور اجانب کی نگرانی میں اپنا کام نہیں چلاؤ گے تمہارے سب کام ابتر رہیں گے۔“

جامعہ اسلامیہ کے لئے یہ روشن خیال بزرگ بجائے مکہ مکرمہ کے جدہ تجویز فرماتے ہیں کیوں کہ وہ ہمیں یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ”ہمارا یہ کام بدگمانی سے مبرا نہیں ہوگا۔“ شاید صاحب خط جو بفضلہ (حاجی) بھی ہیں جدہ ہی سے ہندوستان واپس تشریف لے آئے ہوں گے۔ کیوں کہ ان کا زیارت روضہ نبویؐ سے مستفیض ہونا بدگمانی سے مبرا نہ ہوا ہوگا۔ صاحب خط جامعہ اسلامیہ کی خوش نظمی کے خیال سے تجویز فرماتے ہیں کہ یہ کام ہندوستان کے روپیہ اور ترکی گورنمنٹ کے اہتمام سے لیکن ہمارے بورڈ کی نگرانی میں ہو۔ لیکن ہم یورپ کے مزید اطمینان کے لئے تجویز کریں گے کہ حاجی نواب صاحب اس بورڈ کے صدر ہوں تاکہ مکہ مکرمہ کو مرکز بدگمانی بنانے کا خلاف عقل فعل سرزد نہ ہو۔ ہم نواب صاحب کو ان کی قیاسی پیشن گوئی کی کامیابی پر دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں کیوں کہ ترکی گورنمنٹ نے جامعہ اسلامیہ کے لئے ڈیڑھ

لاکھ روپیہ سالانہ کی مستقل امداد اپنے خزانہ سے دینا منظور فرمالیا ہے اور ساتھ ہی نواب صاحب کی جدہ والی تجویز کی ناکامی پر دلی افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کی یہ تجویز دربار خداوندی سے مسترد ہوئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔
راقم خاکسار سید افتخار حیدر زیدی۔ علی گڑھ۔

(۵)

حرم محترم میں جامعہ اسلامیہ

عنوان متذکرہ الصدر سے ۱۵ اپریل کے زمین دار میں علامہ شبلی نعمانی کا جو مختصر مضمون شائع ہوا تھا اس سے متاثر ہو کر بنگلور کے نواب وقار نواز جنگ بہادر اور نواب حاجی محمد اسماعیل خاں صاحب رئیس علی گڑھ نے دو مضمون روانہ فرمائے ہیں جو آج شعبہ مراسلات میں کسی دوسری جگہ بحسنہ درج کر دیئے گئے ہیں۔ ان مضامین میں جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں وہ ۲۲ اپریل سے پہلے یعنی اس وقت کے ہیں جب کہ یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ خود دولت علیہ عثمانیہ مدینہ منورہ میں ایک دارالعلوم وسیع پیمانے پر قائم کرنا چاہتی ہے۔ یہ نواب وقار نواز جنگ بہادر کے خلوص اور نیک نیتی کا اثر ہے کہ وہ جس بات کے متمنی تھے اس کا خدا نے پردہ غیب سے خود بخود ظہور کرایا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ خدائے قادر و توانا نواب صاحب کے ارادوں میں قوت عطا فرمائے اور دیگر برادران اسلام کو ان کے اسوہ حسنہ کی تقلید کی توفیق بخشے۔

نواب حاجی محمد اسماعیل خاں صاحب نے اپنے مضمون میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ کوئی انوکھے اور نرالے نہیں بلکہ وہی پیش پا افتادہ باتیں ہیں جو نواب صاحب مددِ اب سے چند بار پیشتر وقتاً فوقتاً بار بار فرما چکے ہیں۔ نواب صاحب فرماتے ہیں کہ اگر مکہ معظمہ میں دارالعلوم قائم کیا جائے گا تو ہمارا یہ کام بدگمانی سے مبرا نہیں ہوگا۔ پس مکہ مکرمہ کو مرکز بدگمانی بنانا خلاف عقل ہے۔ یونیورسٹی جدہ میں قائم ہونی چاہئے اور وہاں بھی احتیاط اس امر کی مقتضی ہے کہ یورپین معلم و منتظم اس کی روح رواں ہوں تاکہ ہمارے کام پر کسی قسم کا اشتباہ نہ ہو سکے۔

بہت کچھ غور و تامل کے بعد بھی یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ مکہ معظمہ میں جامعہ اسلامیہ کا وجود کسی سلطنت کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے کا باعث کیوں کر ہو سکتا ہے۔ کیا اس یونیورسٹی میں ہم سازی کی تعلیم دی جائے گی۔ کیا اس کے معلم متعلمین کو توپیں ڈھالنے کا کام

سکھائیں گے۔ کیا اس کا درسی نصاب ایسی کتابوں پر مشتمل ہوگا جن میں مسلمانوں کو یورپین اقوام کے برخلاف بھڑکانے کی کوشش کی جائے گی۔

ہم نواب صاحب کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی یونیورسٹی ایک وسیع دارالعلوم ہوگی نہ کہ کرپ کا عظیم الشان کارخانہ۔ پھر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ہمارے کام پر بدگمانی یا اشتباہ کرنے کی خاص وجہ کیا ہو سکتی ہیں۔ یہ دراصل ایک وہم ہے جو جناب نواب کو اکثر مواقع پر ناحق پریشان کئے رکھتا ہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں مسلمانان ہند کی سعی و کوشش کے بغیر ہی قائم ہو گئی اور ہم ناک بدگمانی کا ہدف ہونے سے بچ گئے۔ حد سے بڑھتی ہوئی احتیاط بھی وہم کے مرادف ہے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ کل کہیں نواب صاحب مدوح یہ نہ کہہ دیں کہ اطراف عالم کے مسلمان جو جج کے موقع پر ہر سال مکہ معظمہ میں بہ تعداد کثیر جمع ہوتے ہیں، ان کا اجتماع بھی شک و شبہ سے خالی نہیں اور ہر حاجی کے ساتھ گورنمنٹ کو ایک جاسوس کراما کاتین کی طرح متعین کر کے سرزمین حجاز میں روانہ کرنا چاہئے۔ افسوس ہے کہ مسلمان اپنی بہتری کی جو تدابیر سوچتے ہیں ان کے متعلق نہ صرف غیر اقوام بلکہ خود برادران اسلام کو ایسی الٹی سیدھی باتیں سوجھتی ہیں جو چلتی گاڑی میں روڑا ہونے کا باعث بن جاتی ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(۶)

النظر

فی مسئلة الجامعة الاسلامیة فی الحرم المحترم

كما يجوزها العلامة شبلى النعمانی

(۱)

ہو گیا چاک گریباں حیاۓ الفت

قیس شمشیر بکف عازم لیلی نکلا

واقعات حال نے ایک ایک شخص کو آنکھوں سے دکھا دیا ہے کہ اسلام (یعنی مسلمان)

آفتاب لب بام ہو رہا ہے۔ اور اگر عام مسلمان اپنی تمام قوت ایک اجتماعی صورت میں صرف نہ کریں گے تو اب ان کی بقا کی امید نہیں۔ یہ خیال عام ہوتا جاتا ہے لیکن افسوس ہے کہ تدبیر میں

اختلاف ہے۔ اور کوئی خاص مشترک رائے قائم نہیں ہوتی۔ میرے نزدیک سب سے مقدم تجویز یہ ہے کہ مکہ معظمہ میں ایک جامعہ اسلامیہ قائم کی جائے، جس میں تمام مذہبی اور دنیوی (جن میں علوم جدیدہ بھی شامل ہیں) علوم کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ آج کل ہر قسم کی قوت علم پر موقوف ہے۔ اور دراصل علم ہی اصلی طاقت ہے۔ اس لیے آج کل ہر قوم کی بقاء اسی پر موقوف ہے۔ (ملاحظہ ہواخبار زمیندار مورخہ ۱۵/اپریل ۱۹۰۳ء ص ۳ شعبہ مراسلات)

یہ خیال اس شخص کا ہے جو آج ہندوستانی مسلمانوں میں مشہور ادیب، فلسفی، فقیہ، مصلح اور سب سے بڑا مورخ ہے اور جس کا ایشیائی فلسفہ یورپ کے فلسفہ جدید سے بھی روشناس ہے۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ آج مسلمان جس کو سب سے بڑا محبت قوم سب سے زیادہ دل میں درد رکھنے والا، سب سے زیادہ زمانہ کا نبض شناس سمجھتے ہیں۔ وہی سب سے زیادہ خطرناک دھوکا کھاتا ہے۔ اور مسلمانوں پر فتنہ کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ ہیبت ترکی کی بربادی، شوکت ایرانی کی تباہی اور عرب میں قصر اسلام کے منہدم کرنے کا اعدائے اسلام کے ہاں شبیہ دیکھ کر ہم سمجھتے تھے کہ اب مسلمانوں کی سیاحت کی انتہا ہو گئی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بقاء فنا کے آخری فیصلہ سے پہلے ابھی بہت سی منزلیں طے کرنے کو ہیں۔ چودھویں صدی کے ہندی اویسوں اور بلالوں کے لیے ابھی حرین کی اینٹیں اکھڑانا باقی ہے۔

کیوں نہ ٹھہریں ہدف ناوک ہیدا اور ہم

آپ اٹھا لاتے ہیں گرتیر خطا ہوتا ہے

دنیا قدیم سے مشابہ پرست ہے اور شہرت ہمیشہ حقیقت کی دشمن رہی ہے، لوگ کہیں گے کہ مولانا شبلی کی تجویز اور اس پر ایک کل کے لوٹنے کو اعتراض! ہمیں بھی یہ فخر حاصل ہے کہ ہم بھی مولانا کے خوان علم کے زلہ بروار اور ان کے مداحوں میں ہیں۔ لیکن اس بات کو بھولنا نہیں چاہیے کہ ہم جب اس کی مدح کرتے ہیں تو اس کی ذات مقصود نہیں بلکہ اس کے اوصاف پیش نظر ہوتے ہیں۔ جو قابل مدح نظر آتے ہیں۔ اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مدوح کے نقایص بھی مستحسن ہیں۔ بالخصوص جب کہ ان نقایص کا اثر واثبات سے گذر کر جمعیت پر پڑتا ہو۔ میں ایسی جگہ رہتا ہوں جہاں کے من و نماشتاک تک کو تعلیم کو ”صورت پرستی“ میں اس قدر انہماک ہے کہ

درو دیوار سے تعلیم تعلیم و نجات کے تلازم کی صدائے ادعا بلند ہو رہی ہے۔

اور ان دعوؤں کی ہمہ گیری نے ہر کہ دمہ نادان و داناکور پینا تیز ہم آہنگ بنا رکھا ہے۔ اس لحاظ سے میرا بھی یہی فرض ہونا چاہیے کہ آج جہاں تعلیم کا پر عظمت نام آئے میں بھی فوراً اس کے سامنے کہہ چکا ہوں لیکن یہ بات کا ایک پیغام ہوتا ہے اور ہر کام کا ایک **وقت**۔ مولانا کی اس خوفناک تجویز کو دیکھ کر خاموش نہیں رہا جاتا۔ یہ معاملہ اسلام کا معاملہ ہے۔ اور اسلام میں غزالی، سید شہلی اور برکت کی تفریق نہیں، فناء و بقا کی ذمہ داری سب کو بالتسویہ شامل ہے۔ اس تجویز سے اس فتنہ کی ابتدا ہوگی جو تمام عربستان کو تہ و بالا کر دے گا۔ جس کا اثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک و مطہر تک پہنچے گا۔

زمانہ کی نیرنگی دیکھو۔ آج ہمارے مصلح عموماً نہایت احتیاط سے ان امور کو سوچ کر مشورہ کے لیے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جن کا صرف موافقت کا پہلو کھلا ہو اور مخالفت کے پہلو پر زمانہ نے اس شدت و احتیاط کا پہرہ بٹھا رکھا ہو کہ اس پر زبان کھولنے والے کی زبان کٹ جائے، قلم اٹھانے والے کا قلم ٹوٹ کر رہ جائے۔ مولانا کی تجویز بھی اس قبیل سے ہے۔ اس کے اہمال و مضرت پر ہم مولانا سے ہفتوں گفتگو کر سکتے ہیں لیکن اظہار کا رستہ ہیبت ناک پر خار وادیوں سے ہو کر جاتا ہے۔ تجویز کی دلفریبی کے باطن میں خوفناک فتنے ظاہر اور اس کے اصول مسلمہ میں پیچ در پیچ تاریخی مغالطے۔ مولانا کا زہد و اتقا، تبحر علمی اور تاریخ پر کامل عبور، ہمیں حیا آئی ہے کہ اس کو مولانا کی طرف منسوب کریں لیکن چارہ نہیں کہ اشاعت ان کے نام سے ہوئی ہے۔

”آج کل ہر قسم کی قوت علم پر موقوف ہے اور دراصل علم ہی اصلی طاقت ہے۔“ اس میں شک نہیں کہ علم سے علم مروج الوقت مراد ہے۔ اور اس غلط دعویٰ پر مسلمانوں کی شوشی بخت سے آج دنیا کا اس شد و مد سے اعتقاد ہے کہ مخالف آواز کی شنوائی نہیں۔ اس عجیب دعوے پر عجیب تر دلیل یہ ہے کہ زمانے نے اس کلیہ کو ثابت کر دیا ہے۔ یورپ کی جہانگیری کا مدار علم ہی پر ہے اور جاپان ”علم“ ہی کے بل پر دشمن کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ ہے۔ تعجب ہے کہ غلط پرست دنیائے عالم اسباب میں فہم نتائج کے لیے اپنے دل کی کیفیت کو نہیں دیکھتی جو بجائے خود دلائل باہرہ کا مخزن ہے۔ جاپان کو علم نے نجات دی۔ یورپ کی قوت و شوکت ”علم“ ہی کی رہین منت ہے، یہ

سب کچھ صحیح۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم خود گزشتہ پچاس سال میں اس ہزار ہا کوس کی مسافت میں باوجود سرتوڑ کوششوں کے اپنے مقام ابتداء سے گے انچ آگے بڑھے ہیں۔ وہ کون سی رکاوٹیں تھیں جنہوں نے ہمارے پاؤں کوشل کر دیا۔ اور ہم اپنی جگہ سے اس قدر بھی نہ ہل سکے کہ ہماری حرکت کے احساس سے دنیا کو ہماری ہستی کا گمان ہو۔ کیا غلط کار انسان کو خود پرستی سے کبھی اتنی فرصت بھی ہوئی ہے۔ کہ اس پر بھی غور کر سکے۔ واقعات کی صورت اور حالات کے تبدیل نام سے تسلی پا کر مطمئن ہو جانے والی دنیا کہے گی کہ میں تعلیم کا مخالف ہوں اور اس اصول کی حمایت کرتا ہوں۔ جو بزعم عوام آج سے کئی سال پہلے غلط ثابت ہو گیا تھا۔ لیکن یہ سچ نہیں۔ میں تعلیم و تعلم کا حامی ہوں، البتہ اس کی نوعیت سے اختلاف ہے اور اس کو ہمہ کیف اپنی نجات کا ذریعہ نہیں سمجھتا۔ میں جانتا ہوں کہ اس کی بعض صورتیں ایسی ہیں جو بعض مقامات پر ہماری بقا کے لیے زہر ہلا ہل سے زیادہ مہلک ہیں۔ اس وقت ہندوستان سے بحث نہیں بلکہ عرب سے ہے۔

دنیا میں مصری یہودی، یونانی، رومانی، ہندی، اسلامی، نصرانی وغیرہ آج تک کی مشہور قومیں ہیں جن کی جھوٹی سچی تاریخ ہمارے سامنے موجود ہے۔ ہر قوم کا مختصر موقع حیات یہ ہے کہ اس کی ضرورت اور حاجت نے اجتماع پر مجبور کیا۔ پھر جب حاجت برآری کا سامان مہیا ہو گیا تو اس کی جمعیت کے جوڑ ڈھیلے ہونے لگے۔ حصول غایت کے بعد اسباب عشرت کی بوقلمونی اور جذبات بہیمیہ کی پرستش کے انہماک نے کسی بالاتر غایت کو نظر کے سامنے آنے نہ دیا۔ پھر عیش میں فنا ہو کر قوت سلب ہو گئی آخر کسی طاقت ور کی لپیٹ میں آ کر ایسی گری کہ پھر اٹھ نہ سکی۔ ہم نہایت ادب سے استفسار کرتے ہیں کہ حیات الاقوام کی تاریخ میں کیا ان تین درجوں پہ کوئی چوتھا بھی مستزاد ہے، جس چیز کا نام مولانا نے علم اور علمی قوت رکھا ہے اس کو تمام اقوام عالم کی تاریخ میں دیکھ لو۔ اس کا شباب کا زمانہ ہمیشہ انسان کے عیش و عشرت کے عروج سے وابستہ رہا ہے۔ علوم و فنون کی نیرنگی تمدن کے تنوع کی کرشمہ کاری، اصول معاشرت کی نزاکت کو دیکھ کر تعجب کیش دنیا ہمیشہ مرعوب ہو جاتی رہی ہے۔ اور بلا محض اس وقت کو عالمگیر علم نما جہل مرکب کی نیرنگ از مستی اور اس کی طلسم کی..... راز ہی دیکھ کر ہمیشہ معراج کمال و رکمال قوت کا وقت سمجھا ہے۔ آج چار ہزار سال کے واقعات و حالات کا کم و بیش ذخیرہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کو پیش نظر رکھو اور

دیکھو ہر قومیت کا یہی زمانہ جس کو خیال پرست دنیا میں اس لیے عروج شباب سمجھتی ہے کہ اس جھوٹ کی صداقت پر خیال کا امتداد زمان شاہد ہے۔ کیا یہی زمانہ حقیقت میں انحطاط شوکت کا آغاز نہیں ہے؟ اور کیا وہی چیزیں جو مستی شباب کا مایہ ناز ہیں آئندہ کی تباہی و بربادی کی ساماں ساز نہیں ہوتیں۔ یورپ کی ہیبت دیکھ کر تمہیں اس سچ پر جھوٹ کا اشتباہ ہوگا لیکن ژرف نگاہ تاریخ کا ورق گرداں اس سے ناواقف نہیں کہ بایں ہمہ وعادی انانیت ہسپانیہ کے اقتضائے عرب سے لے کر روس کے منتہائے شرق تک تمام یورپ کے ایوان شوکت میں خوفناک تزلزل واقع ہو چکا ہے۔ علوم و فنون کا نام بڑا خوشگوار ہے اور ان کی نزاکتیں دیکھنے والے کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہیں۔ مگر آزادی کی آب و ہوا میں اٹھنے والوں کو نزاکتوں کی حاجت نہیں ہوتی۔ جس کے وہ محتاج ہیں وہ اور ہی چیز ہے۔ عوام پر افسوس نہیں لیکن اس بات سے ضرور ملال ہے کہ آج ہندوستان کے سب سے بڑے مسلمان مورخ کی آنکھ بھی دنیا کی دلفریبیوں کے نظارے میں اس قدر مجھ ہے کہ خود فراموشی کے عالم میں یہ نکات تاریخی اس کے سامنے نہیں آتے حالانکہ آج کل وہ بدیہیات سے ہیں یہ مسئلہ نازک ہے اور تفصیل کا متقاضی لیکن ہمیں اس وقت صرف مولانا کی ذات بابرکات سے خطاب کا شرف حاصل ہے جن کے لیے کسی تاریخ اجمال کو تفصیل کی حاجت نہیں۔ اگر ضرورت پیش آئی تو جہاں تک حالات اجازت دیں گے ہم اس پر شرح و بسط سے گفتگو کریں گے۔

(۲)

اس غلط کلیہ کی دنیا میں مدت سے اشاعت ہو رہی ہے کہ دنیا میں اقوام عالم کی بقا کا انحصار علوم و فنون کے عروج و کمال پر رہا ہے نہایت شاندار ہے۔ اس کی عظمت کو باطل پرست انسان کے اعتقاد نے نہایت پر رعب بنا رکھا ہے۔ اور یہ کچھ تعجب نہیں۔ دنیا میں عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جن دعوؤں کو سطحیت سے بھی نصیب نہیں۔ وہ اپنی سادہ عجوبگی کی وجہ سے خصوصیت سے فروغ پاتے ہیں۔ اور رواج پرور، رسم پرست انسان اس شد و مد پر کار بند ہوتا ہے کہ ان کے مخالف امور خواہ وہ کتنے ہی قریب کیوں نہ ہو اس کو نظر نہیں آتے۔ عوام پر حصر نہیں۔ یہ وہ دلدل ہے کہ اس میں خواص بھی پھنس کر رہ جاتے ہیں اقوام عالم کی تاریخ کو زمیندار رکھ کر دیکھ، بعض واقعات تم ایسے پاؤ گے جو بار بار عود کرتے ہیں اور ہر قوم کی تاریخ حیات میں اس کا وجود پایا جاتا ہے۔

واقعات ہمیشہ اسباب کا نتیجہ ہوتے ہیں اور واقعات کا تماشل اسباب کی مماثلت پر دلیل ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ چند اسباب جوکل ایک واقعہ کے ظہور کا باعث کلی تھے۔ وہ آج بھی اسی واقعہ کو پیدا کریں گے۔ اور جس واقعہ کے مختص اسباب موجود نہ ہوں گے اس کا ظہور میں آنا محال ہے۔ گزشتہ چار ہزار سال کی تاریخ کا سرمایہ موجودہ واقعات کے ساتھ مل کر ہمارے لیے کافی ہے کہ ہم حوادث عالم اور ان کے اسباب و علل پر غور کریں اور ان کے باہمی واسطہ و ارتباط کو اپنے دستور العمل کی ایجاد میں نظر سے ہٹنے نہ دیں ہم اس بات کو بہت عام دیکھتے ہیں کہ جب کبھی کسی اجتماع پر قومیت کا اطلاق ہوا ہے تو اس خیال سے سلطنت و سیاست کے خیال کا انفکاک نہیں ہوا۔ ابتدا میں سلطنت کے باز و کمزور ہوتے ہیں اور ہر قدم پر اجتماع کے فنا کا کھکا لگا رہتا ہے اس لیے جماعت کے کل افراد کی طبیعتیں عموماً اسی نسبت سے ذاتیات سے مستغنی اور اجتماع کے استحکام پر متوجہ رہتی ہیں۔ کچھ دور کا واقعہ نہیں کہ پنجاب میں سکھوں کے فرقہ نے فقیرانہ رنگ میں جنم لیا اور چند ہی سالوں میں وہ طوفان اٹھایا کہ ہندوستان کی اسلامی سلطنت کا مغربی بازو کاٹ کر ڈال دیا۔ جب سلطنت کے وجود میں حسب حیثیت قوت آجاتی ہے تو ہر جماعت کے افراد ذاتیات سے اعتنا کرنے لگتے ہیں حیات اجتماع کے اس زمانے میں انسان کی کاہلی سے جو فارغ البالی کا صحیح نتیجہ ہے ہر قسم کی نزاکت پیدا ہونے لگتی ہے اور یہ محض اس لیے نہیں کہ یہ بات فی نفسہ اس کو مستحسن معلوم ہوتی ہے بلکہ حق یہ ہے کہ اسباب کے اثر سے طبعاً اس کے وجود میں خشونت اور محنت کے تحمل کی طاقت ہی نہیں رہتی۔ پھر طلب آرام، حب ریا و افتخار سرفرازی سے ”تمدن“ (بصریہ) پر زور پڑتا ہے جس کی طمع کاری سے انسان کا حقیقت شناسی کا مادہ مفقود ہوتا جاتا ہے۔ واقعات و حالات کی تاثیر اس کی نگاہ میں تفاوت پیدا کرتی ہے اور اپنی معتاد غلط فہمی سے ”مشنگی اطوار“، ”تہذیب الاخلاق“ اور حسن تمدن اس کا نام رکھتا ہے۔ جس طرح اس مرفہ حالی اور فارغ بالی کے زمانہ میں بڑی کوشش سے جسمانی راحت و عیاشی کے سامان اور ان میں نئی نئی جدتیں پیدا کرتا ہے اسی طرح نہایت کاوش کے ساتھ تاریخ طبع اور دماغی عیاشی پر جھکتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ یہی تفریح طبع اور دماغی عیاشی ہے جس کے دلفریب حقیقت سوز نتیجہ کو سستی پسند بازیچہ پرست دنیا نے ”علوم و فنون“ کا پر عظمت نام دے رکھا۔

تاریخ شاہد ہے کہ اگر جسمانی عیش و عشرت کا میلان ہمیشہ اقوام عالم کی قومیت کے فنا کا باعث ہوتا ہے۔ تو اس فنا میں باطل پرست انسان کے ان نمائشی سطوت و جبروت کے طلسم نما معبودوں یعنی ”علوم و فنون“ نے بھی کچھ کم حصہ نہیں لیا۔ اور ”علوم و فنون“ اگر انسان کی راحت و آرام اور عیش و عشرت کے مرہون احسان رہے ہیں۔ یہ ہمارا دعویٰ ہے جو ایک تاریخی واقعہ کے بیان پر مشتمل ہے۔ ہم اصول ارتقا کی بنا پر نہایت شرح و بسط سے فلسفیانہ رنگ میں اس کے ایک ایک لفظ کو ثابت کر سکتے ہیں اور دکھا سکتے ہیں کہ یہ واقعہ کم و بیش ہر قوم کو پیش آتا ہے اور ہر قوم کی زندگی میں یہی مقام ہے جہاں طبعاً اس کا ظہور ہونا چاہیے۔ برسات کے موسم میں جس طرح حشرات الارض خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں اور ان کے تعدد اور تنوع کا انحصار اسباب کے اجتماع پر ہوتا ہے اسی طرح حیات اقوام کے اس زمانہ میں تاریخ میں ”علوم و فنون“ کے اسباب جمع ہوتے ہیں اور اس کے سوا دوسرا زمانہ ان کی پیدائش کو مد نہیں ہوتا اور افلاک بھی ہو بھی ہو جائے تو اس کا کسی خاص قومیت سے تعلق نہیں ہوتا اور واقعات عالم کے سلسلہ پر اس کا چنداں اثر نہیں پڑتا۔ فی الحال ہم تفصیل سے احتراز کر کے صرف اس قدر مستزاد کرتے ہیں کہ مولانا تاریخ عالم سے واقعات کی بنا پر یا اپنے فلسفہ کے زور سے غالباً اس کو غلط ثابت نہ کر سکیں گے۔ مولانا کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہستی کے جو معنی ہندوستان میں ہیں وہ عرب میں مراد نہیں لیے جاسکتے۔ عرب کو حصول بقا کے لیے آج فلسفہ اور ادب کی ضرورت نہیں۔ بلکہ کسی اور چیز کی ضرورت ہے جسے تمام دنیا جانتی ہے اور وہ محتاج بیان نہیں۔ جو تح جفا کو اگر زندگی مطلوب ہے تو چنچہ اجل سے چھوٹنے کے لیے اس کو ضرور ہاتھ پیر مارنا پڑے گا لیکن اس طرح نہیں بلکہ کسی دوسرے رنگ میں۔ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ آج جب کہ دنیا نے اپنی تاریخ کا سب سے زیادہ عبرت ناک اور سبق آموز ورق کھول رکھا ہے اور مدتوں کے سر بستہ دازوں کے عقدے کھل چکے ہیں ہمارے مولانا اپنے ادب اور تفلسف کے قصر میں بیٹھے ہوئے خلافت مامونی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہاں بھی ”مامون اعظم“ کے بعد ایک بے علم سپاہی یعنی معتمد تھا اور پھر اس کے بعد آل عباس میں کچھ بھی نہ تھا۔ اس بواجبی کو دیکھو کہ آج ہمارے طبیب حرم محترم میں یونیورسٹی قائم کر کے عرب کے مرض کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی یہ دعا ہے کہ نتیجہ اسباب سے نتیجہ پیدا

کریں۔ مولانا!

دل اس کو پہلے ہی ناز و اداسے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضے کا

اس غلط کو ہم صحیح مان لیتے ہیں کہ عرب کی نجات کا بہترین ذریعہ یہی ہے کہ جیتی جاگتی کارآشنا۔ مال فہم دنیا کی آنکھوں کے سامنے مکہ کی سرزمین میں ایک مفید مطلب یونیورسٹی قائم کر دی جائے۔ واقعات کی اس صداقت کو بھی ہم نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ترکی، ایران اور مراکش کے انجام کار کا اقتراب جو یورپ کے ہاتھوں وقوع میں آیا وہ اس حس جنش کا نتیجہ ہے جواب سے چند سال پہلے ان ممالک میں زمانہ کے شور و شر کے اثر سے پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ ضرور پوچھیں گے کہ ترویج ”علوم و فنون“ سے عرب کے مرض کا جو علاج ہوگا تو اس علاج کا اثر ظاہر ہونے کے لیے مولانا کے تخمینہ میں اقل مدت کس قدر ہے۔ تاریخ اس صحیح کلیہ کو بھول نہیں سکتی کہ آزاد، ہم عصر اقوام کا وجود ایک دوسرے کے لیے ہمیشہ خطرناک رہا ہے۔ اور ہر ایک کو دوسرے کے آزاد سے کبھی چارہ نہیں ہوا۔ خصوصاً جب جوار بیت کا واسطہ ہو تو ایک کے استحکام و بقا کا انحصار ہمیشہ دوسرے ضعف و فنا پر ہوتا ہے۔ اور یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ زبردست نے جس طرح طاقت حاصل کی ہے انہیں راہوں پر چل کر کمزور بھی قوت پکڑ لے اور زبردست پلیٹ سے بچ جائے۔ کمزوروں کا کیا ذکر ہے۔ یہ تو وہ مقام ہے جہاں بھلے چنگے جیتے جاگتے فنا کی نذر ہو جاتے ہیں۔ آل عثمان کا تاریخی موقع دیکھو۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ترکی توپ کی گرج نے تمام دنیا سے نصرانیت میں بھونچال ڈال رکھا تھا، یہ وہی ناشائستہ وحشی ”بد تمدن“ ترک تھے جو موٹے موٹے کپڑے پہن کر اور بھاری بھاری پگڑی باندھ کر اپنی اصلیت کے بل پر دشمن کے مقابلہ کو میدان دغا میں نکلا کرتے تھے۔ آخر انہیں ترکوں نے یورپ کے اصول پر یورپ کا مقابلہ کرنا چاہا۔ لیکن جوں جوں اس اغیار پرستی کے دھن میں سرے و حشیانہ عماموں کا بوجھ ہلکا ہوتا گیا اس کے ساتھ ہی قلوب سے ہیبت کی کیفیت ناپید ہوتی گئی۔ اور آج اسی آل عثمان کے درو دیوار سے آہ و فغاں کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ آہ

خلق را تقلید شاں برباد داد

اے دو صد لعنت بریں تقلید باد

مولانا کو غالباً جاپان کی مثال نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ لیکن اب دنیا وہ نہیں جو آج سے پچاس سال قبل تھی۔ آج تو اس کا باد آدم ہی اور ہے جس چیز کو اختیار کر کے جاپان بچ گیا تھا کیا آج روم اور ایران اسی سے فنا نہیں ہوا؟ ہم مریض تھے اور اب مر رہے ہیں۔ ”اصلاح“ کے درودیوار سے یہی صدا ہمارے کانوں میں پہنچ رہی ہے۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتاتا کہ ہماری اس فوری موت کی علت ہمارا مرض ہے۔ یا اس مرض کا وہ علاج جس کے اثر کو ہم نے ہمہ گیر سمجھ لیا تھا اور آج تک سمجھے ہوئے ہیں۔ بلاشبہ مولانا کی تجویز نہایت شاندار ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ یہ اسی خوفناک آواز کی بازگشت ہے۔ جو واقعات نے آج سے پچاس سال پہلے پیدا کی تھی۔ تعجب ہے کہ زمانہ کے شور و شر نے آج تک اس کے زیر و بم پر کچھ بھی اثر نہ کیا۔ قومی صدیوں میں نہیں بلکہ سالوں میں بنا کرتی ہیں۔ اور ”علوم و فنون“ قوموں کو نہیں بنایا کرتے۔ یہ تو خود مابعد کے اثرات اور قوموں کے سکون و اطمینان کے وقت کی تفریح طبع کا نتیجہ ہیں۔ اس تجویز کے کارگر ہونے کے لیے مدت کی فرصت درکار ہے اور مولانا کو یاد رکھنا چاہیے کہ عرب کے لیے آج ۔

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل

گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

(۳)

عرب کا معاملہ ہندوستان کی حالت سے بالکل مختلف ہے۔ اس سے زیادہ مہلک بداندیشی کیا ہوگی کہ ہندوستان میں مسلمانوں نے جن امور کو اپنا مایہ نجات قرار دیا ہے۔ انہیں امور سے عرب کے علاج کی ابتدا کی جائے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی حیات و ممات کا مسئلہ ہندوستان میں سلطنت انگلشیہ کے ضعف و استحکام سے وابستہ سمجھا گیا ہے۔ اور گزشتہ پچاس سال میں جو کچھ کیا گیا ہے۔ یہی اصول اس سب کی بنا رہا ہے۔ لیکن عرب میں اس وقت ہندوستان کے مختص المقام واقعات کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ اور دوسری جگہ دنیا کے سامنے مسلمانوں کے حیات و ممات کا مسئلہ پیش نظر ہو سکتا ہے۔ اور کہا جاسکتا ہے کہ چارہ کار کا انحصار اسی خیال پر ہے۔ لیکن عرب کے نام سے ساتھ خود اسلام ہی کے بقا و فنا کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس سے کسی ذی ہوش کو

انکار نہیں کہ اسلام و سیاست قوام ہیں۔ اور ایک کا وجود دوسرے کے لیے ایسا لازم ہے کہ سیاست کو اسلام سے اگر مطلقاً خارج کر دیا جائے۔ تو رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے دین اور پولس کی نصرانیت میں کوئی ماہہ الامتیاز باقی نہیں رہ جاتا۔ اس اجمال کے سمجھنے کے لیے مطلق ”مذہب“ اور ”اسلام“ ان دو اصطلاحوں کی تفہیم کی ضرورت ہے۔ لیکن آج حالت ایسی ہے کہ اس مقام پر پہنچ کر ہمارے فرشتوں کی بھی زبان جل جاتی ہے۔ بہر کیف اس قدر بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ جس روز کہ اور مدینہ میں اسلام کے ایوان شوکت کے کھنڈروں پر نصرانیت کا پرچم اقبال لہرائے گا۔ اس روز اسلام کا نام بھی دنیا میں باقی نہ رہ جائے گا۔ حیف ہے کہ بائیں ہمہ نزاکت امر ہمارا جو قدم حصول بقا کی راہ میں اٹھتا ہے۔ وہ جادۂ استقامت سے دور ہی پڑتا ہے۔ تاریخ کا دل اس صدیوں کے یاد کیے ہوئے سبق کو بھول نہیں سکتا کہ تقسیم عمل سے اگر صاحبان عمل کو فائدہ پہنچا کرتا ہے تو تقسیم خیالی ہمیشہ دشمنوں کے مفید مطلب ہوتی ہے۔

مولانا نے نہایت احتیاط کے ساتھ اس بات کا اظہار فرمایا ہے کہ اس تحریک میں پولٹیکل رنگ کا شائبہ نہ ہوگا۔ ظاہر ایہ خیال نہایت قرین مصلحت اور انتہا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کا کیا کیجئے گا کہ آج دنیا اس کھلے ہوئے بیچ میں نہیں پھنس سکتی۔ تجاہل کا وقت نہیں۔ آج تمام دنیا اس بات کو مانے ہوئے ہے کہ عرب کی جنبش سے اسلام کا جاگنا مراد ہے۔ اور یہ بات آج زمانہ کی سیاسیات کے علوم متعارف سے ہے کہ اسلام کا اٹھنا یورپ کے بیٹھ جانے کا مترادف ہے۔ اس سچ سے دنیا کی کوئی ذی شعور ہستی انکار نہیں کر سکتی۔ ہم ہزار بار کہیں اور چلا چلا کر کہیں کہ اس سے یہ مطلب مراد نہیں لیکن دنیا اندھی نہیں کہ ہماری طفل تسلی سے بہل جائے۔ اس کی معاملہ فہمی کی دور بین آنکھ ہماری کوتاہ اندیش نظر سے زیادہ روشن ہے۔ کیا ایران کی آفت۔ ترکی کا تہلکہ اور مراکش کی موت سے دنیا کی ہوشیاری ثابت نہیں ہوگئی، تم کہو گے کہ یہ باتیں کہنے کی نہیں۔ لیکن یاد رکھو کہ جو بات آج ہمارے دل میں آرہی ہے وہ مدت سے دنیا کے ناخنوں میں ہے۔ اور یہ کہنا اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہماری اپنی جانوں کو دھوکا دیتا ہے۔ یورپ کا آخری انسانی فرض ہے کہ اپنی قومی اور مذہبی ہستی کی حفاظت کرے۔ وہ عرب کی عادت سے تیرہ سو سال سے آشنا ہے۔ یہ ہونہیں سکتا کہ اس کے ہاتھ سے عرب کو اس قدر مہلت مل جائے۔ وہ وقت گیا جب خانقاہوں میں محال خلا پر

تغ زباں سے معرکہ آرائیاں ہوا کرتی تھیں۔ اب تو دنیا ”استحلالہ“ کے عملی ثبوت پر تلی ہوئی ہے۔ اور تغ تدبیر سے مشکلات کی گرہیں کٹتی جاتی ہیں۔

مولانا نے ناحق ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے اس کام کے لیے دست سوال دراز کیا ہے۔ یہ کام تو ایسا ہے کہ آج غالباً خود یورپ ہی ایک نہیں بیس ایسی یونیورسٹیاں عرب میں قائم کرنے کو تیار ہوگا۔ ترکوں نے قادر علی الاطلاق کی خوشنودی کو پس پشت ڈال دیا اور چاہا کہ ”ترقی تمدن“ اور ”حسن معاشرت“ کے زور سے اپنے حریف دیرینہ کو خوش کر لیں لیکن غیور مطلق کی ہستی آج بھی وہی علو و شان رکھتی ہے جو اس کا ازلی اور اپنی خاصہ ہے جس بات کا تہیہ مولانا کو پیش نظر ہے اس کے نام سے خوش اعتقادی کی جوش شوق سے باچھیں کھل جاتی ہیں۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ آبی زندگی سے طبیعت میں خشکی کی زندگی کے خواص پیدا نہیں ہو سکتے۔ آج بیسویں صدی سچی ہے اور۔

ساقی بجلوہ دشمن ایمان وا گہی

مطرب بنغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

اسلام کے دوستو! ”علوم و فنون کے محبو! خوف خدا کو دل میں جگہ دو۔ اور آل کار سے ڈرو۔ اب کچھ زیادہ دیر کی بات نہیں۔ صرف پانچ چھ سال کا معاملہ ہے۔ اس قدر تو جہی لینے دو۔ جمع کرتے ہیں کیوں رقیبوں کو اک تماشا ہوا ، گلہ نہ ہوا

علم ہمیشہ جہل ہی کی ضد نہیں ہوتا۔ بلکہ بسا اوقات علم کی بھی ضد ہوتا ہے۔ ہم جب کسی کو کچھ پڑھاتے ہیں تو ہمیشہ یہی مقصود نہیں ہوتا کہ مخاطب کو جو چیز یاد نہیں وہ اس کو یاد ہو جائے۔ بلکہ کبھی یہ امر بھی پیش نظر ہوتا ہے کہ جو کچھ اسے یاد ہے وہ بھول جائے۔ اور اس طرح جو ہم یاد کرانا چاہتے ہیں وہ آسانی سے یاد ہو جائے۔ یہ ایک تاریخی راز ہے اور مولانا کی مورخانہ نکتہ اسی اور ثرف نگاہی سے بعید ہے کہ اس سے آشنائی نہ ہو۔ یہ بات روز روشن سے زیادہ روشن ہے کہ آج دشمن نے عرب میں فتنوں کا بیج در بیج جال بچھا رکھا ہے۔ کیا اس کے لیے یونیورسٹیاں بنائی گئیں تھیں؟ اور کیا ان فتنوں کے مقابلہ کے لیے یونیورسٹی کے سوائے دوسرا کوئی حربہ نہیں؟ زندہ تو میں

اپنی ہستی کو بھول نہیں سکتیں۔ وہ ہمیشہ کام میں مشغول رہتی ہیں۔ اس بات کو بھولنا نہیں چاہیے کہ آج زمانہ میں شہرت اور کار کے ساتھ کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہ گئی۔ اس سے زیادہ تعجب کس بات پر ہوگا کہ آج مسلمانوں کے ہاتھ اس کام پر پڑتے ہی نہیں۔ جس میں کوئی نہ کوئی شہرت کا پہلو نہ نکلتا ہو۔ یہاں ہمارا روئے سخن مولانا کی طرف نہیں بلکہ جمہور مسلمانوں کی طرف ہے۔ مولانا کی نسبت ہمارا ایمان ہے کہ ان کی ذات کا رتبہ شہرت سے بالاتر ہے۔ مسلمانوں کی اس سیہ بختی کے زمانہ میں مولانا کی یہ تجویز نہایت حیرت افزا ہے۔ ہم مولانا سے سر دشت اسی قدر التجا کرتے ہیں کہ

غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو

ہمیں دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

اور اپنے ان پریشان خیالات کو اس تعجب پر ختم کرتے ہیں کہ آج ہندوستان کا سب سے بڑا مسلمان مورخ اور فاروق اعظم کے سوانح حیات کا مولف۔ اسلام پر عیسائیت کے آخری ”احسان“ کو دیکھ کر بیتاب ہو جاتا ہے اور منبع وادائے اسلام یعنی عرب کی حفاظت پر کمر ہمت باندھتا ہے لیکن ہندوستانی زندگی کی نزاکت سے اس کا دماغ تخیل آفتاب مکہ کی تمازت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اور فوراً طائف کے اعتدال کی طرف خیال کا انتقال ہونے لگتا ہے۔ العجب۔ العجب۔ ثم العجب۔

قیس محل میں ہو وقف تپ صحرا لیلیٰ

اس ہیج میرز کو مولانا کی ذات بابرکات سے جو عقیدت ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے کہ اس کا کما حقہ اظہار ہو سکے۔ اور اس بیان سے مولانا کی مقدس ذات پر حملہ (نعوذ باللہ من ذلک) مقصود نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی تحریر سے طبیعت میں رنج پیدا ہو، جو قلم کی زبان سے مجبوراً ٹپک پڑا۔ امید ہے کہ مولانا اس غائبانہ ارادت کیش کو اپنی عالی حوصلگی سے بنظر عفو دیکھیں گے۔ انما هذا اقوال والسلام علی من اتبع الهدی

ظفر علی

بی۔ ایس۔ سی (علیگ) مدرسۃ العلوم علی گڑھ

تیسرا مراسلہ: مولوی عبدالکریم کی معطلی

مولوی عبدالکریم صاحب ندوہ میں استاد تھے۔ مئی ۱۹۱۲ء میں علامہ شبلی نے ماہنامہ الندوہ کی ادارت سے استعفیٰ دیا تو ان کی جگہ مولوی عبدالکریم صاحب الندوہ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ انھوں نے اپنی ادارت کے پہلے ہی شمارہ میں جہاد پر ایک مضمون لکھا جو قابل اعتراض قرار پایا چنانچہ دارالعلوم ندوہ کی انتظامیہ نے انھیں کچھ دنوں کے لئے معطل کر دیا اس معطلی میں ندوہ کے تمام معتمدین شریک تھے مگر پھر یکے بعد دیگرے علامہ شبلی کے سوا دیگر معتمدین نے مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی سے اپنی برأت ظاہر کی اور تمام تر ذمہ داری علامہ شبلی کے سر ڈال دی۔ علامہ شبلی نے ایک مراسلہ کے ذریعہ جو زمیندار میں شائع ہوا ہے اپنے موقف کا اظہار کیا ہے۔ یہ مراسلہ درج ذیل ہے:

السلام علیکم۔

میں دس دن سے سخت علیل ہوں اور صاحب فراش، میرے متعلق آج کل جو اتہامات اور اکاذیب کا طوفان برپا کیا گیا ہے میں اس سے بے خبر نہیں ہوں، لیکن اول تو میری عام عادت ایسے موقعوں پر سکوت کی ہے، ثانیاً سخت بیماری کی وجہ سے میں کچھ نہ لکھ سکا۔ مفصل بعد صحت لکھوں گا۔ اس وقت مختصر اچند امور گزارش ہیں۔

۱۔ میں نے اس وقت تک کوئی تحریر گورنمنٹ کے کسی افسر کو مولوی عبدالکریم صاحب کے متعلق خود نہیں بھیجی، نہ میں اس وقت تک کسی افسر سے اس معاملہ کے پیش آنے کے وقت سے اب تک ملا۔ جو تحریریں گورنمنٹ میں گئی ہیں وہ دفتر نظامت سے گئی ہیں، جو میرے محکمہ سے بالاتر محکمہ ہے۔

۲۔ جس جلسہ میں مولوی عبدالکریم صاحب کا تا جلسہ انتظامیہ معطل ہونا طے ہوا تھا اس میں پانچ حضرات شریک تھے، یعنی جناب مولوی عبدالباری صاحب فرنگی مٹلی، مولوی ظہور احمد صاحب (۱)، مولانا مولوی سید عبدالحی صاحب، منشی احتشام علی صاحب سکرٹری مال (۲)، اور خود میں۔ اس جلسہ میں جو متفقہ انگریزی یادداشت مرتب ہوئی، مولوی ظہور احمد صاحب نے کی اور

بذریعہ دفتر نظامت کے ڈپٹی کمشنر صاحب کے پاس بھیجی گئی، اس پر تینوں سکریٹری کے دستخط تھے یعنی مولانا سید عبدالحی صاحب، منشی احتشام علی صاحب اور خود میرے۔ اردو تحریر میں اضافہ کے متعلق جو مجھ پر اعتراض ہے، اس کی بابت بعد کو لکھوں گا، اس وقت یہ عرض ہے کہ میں نے اپنی یاد سے اردو یادداشت میں جو لفظ اضافہ کیا وہ دفتر نظامت میں بھیج دیا گیا تھا اور وہ ایسا امر نہیں کہ اس پر واقعہ کا کوئی انحصار ہو۔

۳۔ یہ امور کہ مضمون مذکورہ کا مقاصد ندوہ کے خلاف ہے اور اس کی اطلاع ڈپٹی کمشنر صاحب کو دینی چاہئے اور یہ کہ پرچہ (الندوہ) روک دیا جائے اور یہ کہ مولوی عبدالکریم صاحب ایڈیٹری سے معطل لئے جائیں، اس جلسہ کے تمام ارکان مذکورہ بالا کا متفقہ فیصلہ تھا، میں نے کوئی مزید حصہ اس میں نہیں لیا، یہ امر خود ان حضرات سے دریافت کرنا چاہئے، البتہ جب اس جلسہ کے سب ارکان کی یہ رائیں قائم ہو چکیں کہ مضمون، مقاصد ندوہ کے خلاف ہے تو میں نے اس بات پر زور دیا کہ جس طرح مولوی عبدالکریم صاحب کے متعلق یہ سب امور تا جلسہ انتظامیہ طے کئے جاتے ہیں اسی طرح جلسہ انتظامیہ کے منعقد ہونے تک وہ مدرسہ سے بھی معطل رہیں، کیونکہ مدرسہ خاص میری ذمہ داری میں ہے۔

۴۔ ندوۃ العلما کے اکیاون (۵۱) ممبر ہیں، جن میں دو ثلث علماء ہیں، ان کی کثرت آرا اب موصول ہو چکی ہیں۔

جن ارکان نے مضمون مذکورہ کو قابل گرفت خیال کیا اور اس بنا پر مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی تا جلسہ انتظامیہ سے اتفاق کیا ان میں بعض حضرات یہ ہیں۔ جناب حاجی نواب اسحاق خاں صاحب سکریٹری علی گڑھ کالج، جناب حاجی رحیم بخش صاحب پریزیڈنٹ بہاول پور، مولوی حبیب الرحمن صاحب شروانی رئیس علی گڑھ، جناب مولوی نظام الدین صاحب جعفری افسر واعظین مجلس ہدایت الاسلام دہلی، مولوی غلام محمد صاحب فاضل ہوشیار پوری، مولوی قاری عبدالسلام صاحب پانی پتی، امام صاحب جامع مسجد دہلی، حکیم عبدالولی صاحب۔ متعدد اراکین کی رائیں اس کے خلاف بھی ہیں لیکن کثرت آراء اسی طرف ہے۔

۵۔ اس امر پر کہ اصل مضمون قابل گرفت ہے یا نہیں میں بعد صحت تفصیل سے لکھوں گا

۔ اس وقت صرف اس قدر گزارش ہے کہ مضمون مذکورہ دفعہ دس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کوئی مسلمان کسی کافر کی حکومت میں نہیں رہ سکتا اگر رہے گا تو گنہگار ہوگا۔

شبلی نعمانی

(زمیندار لاہور، ۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ء)

چوتھا مراسلہ: مدینہ یونیورسٹی کا نصاب تعلیم

علامہ شبلی نے جس وقت مکہ معظمہ میں جامعہ اسلامیہ کی تجویز پیش کی اس کے چند روز بعد ترکی حکومت کی طرف سے مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ کے قیام کا اعلان ہوا۔ اس میں جن لوگوں کے اسمائے گرامی سرفہرست تھے، ان میں مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر مختار انصاری اور شیخ عبدالعزیز شاولیش خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شیخ شاولیش تو اس کے نامزد وائس چانسلر ہی تھے۔ ان حضرات نے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے نصاب تعلیم بنانے کے لئے علامہ شبلی، ڈاکٹر اقبال اور مولانا حمید الدین فراہی کو نامزد کیا، اس سلسلہ میں علامہ شبلی نے قوم کے نام جو مراسلہ لکھا ہے وہ زمیندار ۲۲ مئی ۱۹۱۳ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔ مراسلہ حسب ذیل ہے:

بخدمت بزرگان قوم

آپ صاحبوں نے اخباروں میں ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ مدینہ منورہ میں ترکی گورنمنٹ جو جامعہ اسلامیہ (یونیورسٹی اسلامی) بنانا چاہتی ہے اس کے متعلق ہم تینوں شخصوں سے بذریعہ تار کے قسط طیفیہ سے پروگرام نصاب تعلیم مانگا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ یہ ایک نہایت اہم کام ہے اور اس کے لیے ضرور تھا کہ ہندوستان کے نہایت قابل علماء اور تعلیم یافتگان جدید کسی موقع پر جمع ہوتے اور پہلے سے یادداشتیں تیار کر کے لاتے اور پھر باہمی مشورے اور گفتگو سے ایک مکمل پروگرام تیار ہو کے وہاں بھیجا جاتا۔ لیکن چونکہ بظاہر اس وقت اس کی امید نہیں معلوم ہوتی کہ ایسا مجمع جمع ہو سکے۔ اس لیے میں حضرات علماء اور تعلیم یافتگان جدید سے درخواست کرتا ہوں کہ ایسے جامعہ کے متعلق جو اصولی باتیں ان کے خیال میں آئیں بذریعہ اخبار زمیندار یا دیگر اخبارات کے شائع فرمائیں۔ اور اگر کوئی صاحب چاہیں تو

پرائیویٹ طور پر بذریعہ ذاتی خطوط کے مجھے مطلع فرمائیں۔ دیگر اخبارات سے امید ہے کہ وہ اس خط کو شائع فرمائیں۔

شبلی نعمانی

۱۸ مئی ۱۹۱۳ء

نیونا گپاڑہ، بھائی کلد، اکبر بلڈنگ نمبر ۲ بمبئی

۱۸ مئی ۱۹۱۳ (روزنامہ زمیندار ۲۲ مئی ۱۹۱۳)

پانچواں مراسلہ: جلسہ دہلی سے متعلق ایک غلط فہمی کی تردید

ندوہ میں معتمدین کے درمیان آپسی اختلاف میں جب شدت پیدا ہو گئی اور ندوہ کی ترقی رک گئی تو ان اختلافات کو حل کرنے کے لئے دہلی میں ایک اجلاس ہونا طے پایا۔ اس اجلاس کے روح رواں حکیم اجمل خاں تھے، اس جلسہ کے متعلق لوگوں میں عجیب عجیب قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں، ان کے سد باب کے لئے علامہ شبلی نے زمیندار ۲۰ مئی ۱۹۱۳ء میں ایک مراسلہ لکھا جو حسب ذیل ہے۔

یہ خیال غلطی سے عام طور پر پھیل گیا ہے کہ دہلی میں ندوہ کی اصلاحی تجویز کے متعلق جو جلسہ ہونے والا ہے، وہ موجودہ کارکن اشخاص کی مخالفت اور ان کے ساتھ معرکہ آرائی کا جلسہ ہے، اس غلط خیال نے تمام پبلک میں ایک اشتعال آمیز (مخالف یا موافق) جوش پیدا کر دیا ہے، تو میں جب ابتدائی ترقی کے دور میں ہوتی ہیں تو ان کا مذاق طبع ہر بات میں اشتعال انگیز پہلو کو ڈھونڈھتا ہے اور اس سے متاثر ہو کر اصل حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ندوہ کے چند امور مسلمہ فریقین ہیں، یہ امر کہ ندوہ میں کچھ خرابیاں ہیں، دونوں کو تسلیم ہے، یہ امر ان خرابیوں یا اصل قانون ندوہ میں اصلاح کی حاجت ہے، دونوں فریق کو تسلیم ہے، گفتگو صرف یہ ہے کہ یہ خرابیاں کس نے پیدا کیں؟ اور اب ان کی اصلاح کا کیا طریقہ ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ ہر فریق دوسرے فریق کو خرابیوں کا ذمہ دار بتاتا ہے اور اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اگر کوئی آزاد کمیشن بیٹھتا تو یہ مسئلہ صاف ہو جاتا، لیکن بہر حال ایسا کرنے میں مخالفت

اور جوش کا زیادہ احتمال ہے، اس لیے سر دست اسی نقطہ کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ خرابیاں کیا ہیں؟ اور اصلاح کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟

طریقہ اصلاح کے متعلق ایک غلط خیال پھیلا ہوا ہے کہ خود ندوہ کے جلسہ انتظامیہ میں یہ خرابیاں پیش کی جاسکتی ہیں اور وہ خود ان کی اصلاح کر سکتا ہے، لیکن واقعات یہ ہیں کہ جس زمانہ سے یہ خرابیاں اور بے ضابطگیاں ہیں، اس زمانہ سے یہ مسئلہ بارہا ندوہ کے ارکان کے سامنے آچکا ہے، سب سے پہلے ندوہ کے اصل قانون کا معاملہ ہے، دونوں فریق قانون کی بعض دفعات کی لغویت اور بد اثری کو تسلیم کرتے ہیں، اس بنا پر متعدد جلسہ ہای انتظامیہ میں اس کی اصلاح کی خواہش کی گئی اور ہر صیغہ کے سکریٹری نے جن دفعات کو صاف کرنا یا ترمیم و تنسیخ کرنا ضروری سمجھا، اس کے متعلق اپنی تحریری رائیں لکھ کر بھیجیں، ایک جلسہ انتظامیہ میں طے ہوا کہ مولوی ظہور احمد صاحب وکیل کے پاس یہ تمام رائیں بھیجی جائیں اور وہ سب کو غور سے پڑھ کے ایک مسودہ تیار کریں جو جلسہ خاص میں پیش کیا جائے، دو برس گزر جانے پر بھی کچھ کام نہیں ہوا، بالآخر مولوی صاحب موصوف سے لے کر ایک اور ممبر صاحب کے حوالہ کیا گیا اور پھر بھی کچھ نہ ہوا، اسی بنا پر یہ کہنا صحیح نہیں کہ خود ندوہ سے اصلاح کی خواہش نہیں کی گئی۔

دیگر معاملات کے متعلق تین دفعہ سرگرم کوششیں ہوئیں، ایک دفعہ مولوی عبدالباری صاحب نے جو اس وقت ندوہ کے ممبر تھے، اس کی کوشش کی اور مطبوعہ خطوط جاری کیے، دوسری دفعہ مرزا ظفر اللہ خاں صاحب رکن ندوہ نے اصلاحی یادداشت چھاپ کر تمام ممبروں کے پاس بھیجی، میں نے بارہا اصلاحی معاملات پر توجہ دلائی، یہاں تک کہ ایک دفعہ مطبوعہ خطوط کے ذریعہ سے یہ تحریک پیش کی کہ لبرل اور کنسرویٹو گروہوں کی طرح ایک خاص مذاق کے ممبر چند برس کے لیے ممبری کے کام سے دست کش ہو جائیں اور دوسرے فریق کے ممبر چند برس کے لیے ممبری کے کام سے دست کش ہو جائیں اور دوسرے فریق کو کام کرنے دیں اور اس کی ابتدا میں نے اپنی دست کشی سے کرنی چاہی، لیکن جلسہ انتظامیہ میں یہ تجویز بھی نا منظور ہوئی۔

ان واقعات کے بعد قریباً ایک سال تک اخبار وکیل نے ندوہ کے نقائص پر لیٹر اور مضامین شائع کیے، لیکن پبلک کو مطلق احساس نہ ہوا۔

حالات مذکورہ کے بعد کیوں کر کہا جاسکتا ہے کہ اصلاح کی خواہش کی یہ پہلی صدا ہے اور اس سے کسی فریق کی توہین یا تذلیل مقصود ہے۔

دہلی کے جلسہ کا یہ پروگرام ہے کہ دونوں فریق الگ الگ اصلاحی پروگرام مرتب کر کے لائیں، ان میں جن اصلاحات پر دونوں فریق کا اتفاق ہو وہ اسی وقت جلسہ میں مشتہر کر دی جائیں، جن میں اختلاف ہو، ان کے تصفیہ کے لیے جلسہ کی طرف سے ایک سب کمیٹی مقرر کر دی جائے، اس میں ندوہ کے ارکان انتظامی بھی ممبر بنائے جائیں۔

اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے کہ ایسے مباحث نہ پیش ہوں جن سے ذاتیات معرض بحث میں آئیں، بلکہ ان امور کو لیا جائے جن کا تعلق ندوہ کے اصل قانون اور دستور العمل سے ہے اور جن کے فیصلہ کے لیے جزئی واقعات کے تحقیق کرنے کی ضرورت نہ ہو، بلکہ خود قانون کا مطالعہ ان کا فیصلہ کر سکے مثلاً یہ بحث کہ موجودہ کارکن اور عہدہ دار واقعی عہدہ دار مجاز ہیں یا نہیں، واقعات کا چنداں محتاج نہیں، بلکہ اصل قانون پر نظر ڈالنا کافی ہو سکتا ہے اور جس قدر واقعات کی شہادت اس کے لیے درکار ہے وہ کھلے ہوئے اور نمایاں واقعات ہیں، مسلمانوں کی موجودہ بیداری کا سب سے نمایاں واقعہ عام قومی اجتماع ہے، لیکن اگر اس دور میں بھی کوئی قومی انسٹیٹیوشن صرف چند اشخاص کے ہاتھ کا بازیچہ بن کر رہ جائے تو قومی زندگی کی طرف سے بالکل مایوس ہو جانا چاہیے۔

ارکان ندوہ کے علاوہ جو لوگ اس مسئلہ کو قوم میں لانے کے مخالف ہیں، صرف دو قسم کے لوگ ہیں، یا وہ ہیں جو آج ۲۲ برس سے ندوہ کے مخالف اور اس کے وجود کے دشمن ہیں، ان کو اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ ندوہ کل کا تباہ ہوتا ہوا آج تباہ ہو جائے، یا وہ لوگ ہیں جو خود کسی انسٹیٹیوشن پر اسی طرح خود مختار نہ قابض ہیں اور ڈرتے ہیں کہ اس آگ کے شعلے پھیلنے پھیلنے ان کے گھر تک نہ پہنچ جائیں۔ فقط

شبلی نعمانی

(زمیندار، ۲۰ مئی ۱۹۱۴ء)

ان مراسلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب بھی علامہ شبلی کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تھا تو وہ

اپنے اظہار خیال کے لئے زمیندار ہی کو ذریعہ بناتے تھے اور اس میں مراسلہ لکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔

یہ تینوں مراسلے نو دریافت ہیں اس سے پہلے ان کا کہیں حوالہ نہیں ملتا۔

شبلی، اقبال اور خواجہ

روزنامہ زمیندار میں مذکورہ عنوان سے تینوں حضرات کی خط و کتابت شائع ہوئی ہے چونکہ یہ خط و کتابت بے حد اہم ہے اور علامہ شبلی کا خط بالکل نادر خط ہے، اس لئے یہ خط و کتابت یہاں نقل کی جاتی ہے۔ خط و کتابت سے پہلے مولانا ظفر علی خاں کا درج ذیل نوٹ شائع ہوا ہے:

خواجہ کمال الدین صاحب جو ایک مقدس فرض کی تکمیل کے لئے وطن سے بے وطن اور گھر سے بے گھر ہوئے ہیں اس ہفتے کی ولایتی ڈاک میں اپنے مستقر سے اطلاع دیتے ہیں کہ رسالہ مسلم انڈیا کی اشاعت پر میں نے علامہ شبلی نعمانی کی خدمت میں بھی ایک پرچہ روانہ کیا تھا جس کی رسید انھوں نے خاص الفاظ میں عنایت فرمائی۔ پھر اس رسید کے شکریہ میں میں نے علامہ شبلی کی خدمت میں ایک اور خط بھیجا۔ اب یہ تمام خط و کتابت زمیندار میں درج ہونے کے لئے روانہ کی جاتی ہے۔ آخر میں خواجہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ اقبال کا بھی ایک خط موصول ہوا ہے لیکن میں نے براہ راست ان کو جواب نہیں دیا۔ زمیندار ہی کے ذریعہ سے میرا پیغام ان تک پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ ہم بہ تعمیل ارشاد خواجہ صاحب مخلص و مسرت وہ خط و کتابت ذیل میں درج کرتے ہیں:

علامہ شبلی کا مبارک نامہ بنام خواجہ کمال الدین

مبارک ہو!

کامل اس فرقہ زہاد سے اٹھا نہ کوئی

کچھ ہوئے تو یہی زندان قدح خوار ہوئے

کچھ کریں گے تو آپ ہی لوگ کریں گے اور سب آپ کا ساتھ دیں گے۔ رسالہ کے

لئے احباب اور دوستوں کو لکھتا ہوں۔ (شبلی ۲ مارچ)

جواب خواجہ

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دل میں ایک اضطراب ہے جس نے بے چین کر رکھا ہے۔ میں نہ خدمت قوم کا اہل اور نہ کسی پراحسان۔ اپنے ہی دل کی تڑپ سے تسکین چاہتا ہوں۔ جو لوگ اس درد میں شریک وہم نوا ہیں خدا ان کا بھلا کرے۔ باقی رہا ہم میں سے کچھ اور لوگوں کے اٹھنے کا معاملہ تو تین اصحاب نے میرے آقا حضرت میرزا صاحب علیہ السلام کے دست مبارک پر دین کو دنیا پر مقدم رکھنے کا حتمی وعدہ کیا ہے۔ آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ ان میں بعض اپنا وطن چھوڑ کر خدمت دین کے لئے بہت جلد اس طرف آنے والے ہیں۔

حسب ارشاد مسلم انڈیا اپریل نمبر کے مزید پرچے مرسل خدمت کئے جائیں گے۔ اس کی امداد و خریداری ہندوستان میں جس نسبت سے بڑھے گی، اسی تناسب سے یہاں اس کی مفت اشاعت کا دائرہ وسیع ہوگا۔ کمال الدین از لندن

علامہ شبلی کی مخالفت

اس عنوان سے زمیندار کے ایک شمارہ میں مراسلہ شائع ہوا ہے، مگر وہ اس قدر بوسیدہ ہے کہ پڑھا نہیں جا سکا۔ غالباً مولوی عبدالکریم صاحب کی ندوہ سے معطلی پر کسی نے لکھا ہوگا، چونکہ اس زمانہ میں علامہ شبلی کے خلاف متعدد مراسلات شائع ہوئے اور مختلف اخبارات مثلاً مسلم گزٹ لکھنؤ وغیرہ میں چھپے اس لئے قیاس ہے کہ اس سلسلہ کے بعض مراسلات زمیندار میں بھی شائع ہوئے ہوں گے۔

وفات کی خبر

نومبر ۱۹۱۴ء میں علامہ شبلی جب سخت علیل ہوئے اور زندگی کی امید جاتی رہی تو انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا سید سلیمان ندوی کو تار بھیج کر بلوایا۔

مولانا سید سلیمان ندوی جب اعظم گڑھ پہنچے تو ان کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اخبارات کو اس کی اطلاع دی۔ روزنامہ زمیندار میں یہ اطلاع ان لفظوں میں شائع ہوئی ہے:

”مولانا شبلی مایوس کن درجہ میں بیمار ہیں۔ اسہال کسی طرح نہیں رکھتے۔ وہ وقت نہ

آئے کہ میں قوم کو قیمتی کا پیغام سناؤں“ (زمیندار ۲۰ نومبر ۱۹۱۴ء)

اس اطلاع پر ایڈیٹر نے ایک نوٹ لکھا ہے کہ

یہ خط اعظم گڑھ سے آیا ہے جہاں اس وقت علامہ موصوف صاحب فراش ہیں اور ہمارے فاضل دوست (مولانا) سید سلیمان ان کی عیادت کو تشریف لے گئے ہیں۔ اس حالت اضطرار میں ہم بجز اس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہندوستان بھر کو یہ دعا کرنی چاہئے کہ اس کا روشن ترین آفتاب علم و اسلام و تاریخ ہمیشہ منور رہے۔ عجل اللہ شفاءہ و ازال و ابداءہ۔ (ایضاً)

اسی نوٹ کے نیچے ان کی وفات کی خبر شائع ہوئی ہے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

مولانا سلیمان ۱۸ نومبر کو بذریعہ تار اطلاع دیتے ہیں کہ پندرہ روز تک مبتلائے مرض رہنے کے بعد مولانا شبلی کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(زمیندار ۲۰ نومبر ۱۹۱۴ء)

۵۔ تعزیتی خبریں

علامہ شبلی نعمانی کی وفات کی خبر سے ہر طرف صف ماتم بچھ گئی۔ مختلف شہروں اور قصبات میں تعزیتی جلسے منعقد ہوئے اور قراردادیں منظور ہوئی۔ روزنامہ زمیندار میں متعدد تعزیتی خبریں شائع ہوئی ہیں۔ اس طرح کی جو خبریں دستیاب ہو سکیں وہ یہاں درج کی جاتی ہیں:

لاہور

- مسلم معلمین فورمن کرسچن کالج لاہور کے ایک غیر معمولی جلسہ منعقدہ..... ۱۹۱۴ء میں حسب ذیل رزولوشن باتفاق رائے پاس ہوئے۔
- ۱۔ ہم مسلم معلمین فورمن کرسچن کالج لاہور علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی وفات حسرت آیات پردلی رنج و تاسف کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم مولانا مغفور کی ناگہانی موت کو مسلمانان ہند کے لئے ایک عظیم قومی نقصان تصور کرتے ہیں۔ ہمیں مرحوم کے اعزہ و اقارب سے حقیقی ہمدردی ہے اور ہم دعا کرتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے پسماندوں کو اس صدمہ جانکاہ میں صبر جمیل عطا فرمائے۔
- ۲۔ قرار پایا کہ مرحوم کے سب سے قریبی رشتہ دار کے ہاں ایک پیغام تعزیت بذریعہ تار روانہ کیا جائے اور مندرجہ رزولوشن کی نقول اخبارات کو بغرض اشاعت بھیجی جائیں۔

میرٹھ

- مسلمانان میرٹھ نے نہایت دلی تاسف کے ساتھ مولانا مرحوم کے انتقال کی خبر کو سنا اور بعد نماز جمعہ ان کی مغفرت کے لئے دعا کی اور حسب ذیل رزولوشن بالاتفاق پاس ہوا۔
- رزولوشن: مسلمانان میرٹھ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کی رحلت کو قومی بد قسمتی سمجھتے ہیں اور ان کے پس ماندوں سے اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔
- نجم الدین احمد، میرٹھ

راول پنڈی

- ۲۷ نومبر کو بعد نماز جمعہ اسلامیہ ہائی اسکول کے ہال میں بہ سہرپرتی مسلم ایسوسی ایشن

راول پنڈی مسلمانان پنڈی کا ایک خاص جلسہ زیر صدارت شیخ محمد خاں صاحب آنریری مجسٹریٹ سب رجسٹرار پریزی ڈنٹ مسلم ایسوسی ایشن منعقد ہوا۔ سب سے پہلے صدر جلسہ نے افتتاحی تقریر میں جلسہ کے انعقاد کی وجہ بیان کی۔ اس کے بعد چودھری عبدالغنی بیرسٹرایٹ لائے علامہ مرحوم کی اسلامی خدمات اور قابل قدر تصنیفات کا ذکر کیا جو مسلمانوں کے علمی خزانہ میں بیش بہا جواہر ہیں۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو، ملک غلام حسین صاحب، راجہ خداداد خاں صاحب اور راقم الحروف نے بھی اسی قسم کے خیالات ظاہر کئے۔

جلسہ میں ڈاکٹر سیف الدین صاحب کچلو بیرسٹرایٹ لائے اپنے ایک دوست شیخ محمد فاروق صاحب نو مسلم کا تعارف کرایا، شیخ صاحب کو مشرف بہ اسلام ہوئے کچھ عرصہ گزرا ہے، آپ کیمبرج یونیورسٹی کے گریجویٹ اور انگلینڈ کے ایک اعلیٰ خاندان کے ممبر ہیں اور سرکاری ملازمت میں کسی اعلیٰ عہدہ پر رہ چکے ہیں مگر اسلامی کتب کے مطالعہ اور اسلامی حقانیت نے ان کے دل پر ایسا اثر کیا کہ اپنی دنیاوی وجاہت کو خیر باد کہہ کر اسلام قبول کرنے ہی میں اپنی نجات اخروی سمجھی، حاضرین شیخ صاحب سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ شیخ صاحب نے اس جلسہ میں بھی حصہ لیا۔ جلسہ میں مندرجہ ذیل رزلوشن منظور کئے گئے:

چونکہ علامہ شبلی کی وفات سے اہل اسلام کو سخت قومی صدمہ محسوس ہوا ہے اس لئے یہ جلسہ ان کی وفات پر بے حد رنج و ملال کا اظہار کرتا ہے اور دست بدعا ہے کہ خداوند تبارک و تعالیٰ علامہ مغفور کی مغفرت کرے اور انھیں خلد بریں میں جگہ دے۔

محرم: چودھری عبدالغنی صاحب بیرسٹرایٹ لا، مؤید: ڈاکٹر سیف الدین صاحب کچلو بیرسٹرایٹ لا و خاں صاحب راجہ خداداد خاں صاحب سب انجینئر۔

۲۔ یہ جلسہ علامہ مرحوم کے اعزہ واقارب کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور تجویز کرتا ہے کہ علامہ مرحوم کے فرزند ارجمند کو اس ایسوسی ایشن کی طرف سے تعزیت نامہ بھیجا جائے۔

محرم: ملک غلام حسین صاحب گورنمنٹ پشاور۔ مؤید: ملک غلام محی الدین ہیڈ کلرک ڈی، ٹی، ایس آفس و مولوی محمد حسین صاحب بی اے ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول۔

۳- یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ علامہ مرحوم کی مستقل یادگار قائم کرنے کے لئے محمد بن کالج علی گڑھ، انجمن حمایت اسلام وندوة العلماء لکھنؤ سے استدعا کی جائے کہ وہ علامہ مرحوم کی مستقل یادگار قائم کرنے کے لئے کیا تجاویز مناسب خیال کرتے ہیں۔

محرم: شیخ محمد فاروق صاحب، مؤید: ڈاکٹر شیخ قمر الدین صاحب بٹ۔
راقم ملک غلام محی الدین ہیڈ کلرک ڈی، ٹی، ایس آفس
راول پنڈی

لکھنؤ

۶- دسمبر ۱۹۱۴ء کو ارکان مسلم کلب لکھنؤ کا ایک جلسہ زیر صدارت جناب نظام الدین حسن صاحب دارالمباحث میں منعقد ہوا۔ شمس العلماء شبلی نعمانی کی وفات حسرت آیات پر اظہار افسوس اور دعائے مغفرت کے علاوہ حسب ذیل رزولوشن منظور کئے گئے:

(۱) ارکان مسلم کلب لکھنؤ کا یہ جلسہ شمس العلماء شبلی نعمانی مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے۔ ان کی وفات سے ایک لائق عالم دارالبقا کو چلا گیا، باری تعالیٰ ان کو مسرت ابدی عطا فرمائے اور ان کے اعتقاد کو صبر جمیل بخشے۔

(۲) یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ رزولوشن نمبر ۱ کی نقل ان کے فرزند جناب محمد حامد نعمانی کی خدمت میں مرسل ہو اور جلسہ کی روداد بغرض اشاعت اردو اور انگریزی اخبارات میں بھیجی جائے۔
بوقت افتتاح جلسہ عبدالرحمن صاحب ندوی نے علامہ مغفور کے حالات بیان فرمائے۔

(آنریبل سکریٹری مسلم کلب لکھنؤ)

بارہ مولہ

مولانا شبلی نعمانی کے انتقال پر ملال کی خبر ۱۱ محرم کو اخبار زمیندار کے ذریعہ سے معلوم

ہوئی، اس روز حاجی خواجہ عبدالصمد صاحب مکرو نے بتقریب میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ائمہ علماء و سادات کو دعوت دے رکھی تھی، خواجہ صاحب نے ختم سے پہلے اس مجلس میں مولانا کی وفات کی خبر سنائی اور ان کے اوصاف و محامد بیان کر کے حاضرین سے فرمایا کہ اب آہ و فغاں بے کار ہے۔ ان باتوں سے شبلی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ بہتر ہے کہ جملہ حضرات کلمہ وفات پڑھ کر علامہ مرحوم کی روح کو ثواب بخشیں۔ چنانچہ اہل مجلس نے نہایت خضوع اور خشوع سے فاتحہ وغیرہ پڑھی اور قرار پایا کہ خواجہ صاحب کے دیوان خانہ میں کل ایک خاص جلسہ تعزیت منعقد کیا جائے۔ چنانچہ اگلے دن دس بجے خصوصیت سے سو گواران شبلی کا اجتماع ہوا اور خواجہ صاحب نے علامہ کی قابلیت و فضیلت پر مفصل تقریر کی اور ان کی مقبول عام تصانیف اور قومی کارناموں کا بھی بوضاحت تذکرہ کیا۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل رزولیشن منظور ہوئے۔

(۱) یہ جلسہ علامہ شبلی نعمانی کی وفات پر اظہار افسوس اور یہ تجویز کرتا ہے کہ مرحوم کے پس ماندوں خصوصاً مولوی حامد صاحب فرزند علامہ مغفور کی خدمت میں پیغام تعزیت بذریعہ تار روانہ کیا جائے۔

حرک: حاجی خواجہ عبدالصمد مکرو۔ مؤید: خواجہ عبدالغفار مکرو۔

(۲) یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ اس وقت جس قدر علماء و ائمہ مساجد یہاں موجود ہیں۔ وہ آئندہ نماز جمعہ کے موقع پر اپنی اپنی مساجد میں کلمات تحیات پڑھ کر مولانا کی روح کو ثواب پہنچائیں اور دعائے مغفرت مانگیں۔

حرک: حاجی خواجہ عبدالصمد مکرو۔ مؤید: خواجہ عبدالغفار مکرو۔

خواجہ صاحب نے رزولیشن منظور ہونے کے بعد بھی تقریر کی اور فارسی و اردو کے چند اشعار پڑھے۔

(نامہ نگار از بارہ مولا)

کلمتہ

کارروائی جلسہ تعزیت علامہ شبلی نعمانی مرحوم جو ایک عظیم الشان جلسہ منعقدہ ۸ دسمبر

۱۹۱۴ء ۸/ بجے شب میں ہوئی۔

(۱) تحریک صدارت

محرم: حکیم رکن الدین صاحب دانا۔ مؤید: مسٹر غیاث الدین و محمد حسن خاں صاحب۔

(۲) تقریر صدارت: ڈپٹی سید نجم الدین احمد صاحب

(۳) تجویز نمبر ۱۔ یہ جلسہ شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کی وفات کو نہ صرف مسلمانان ہند بلکہ

تمام عالم اسلامی کے لئے ایک ماتم عظیم یقین کرتا ہے اور اسلامی علوم و ادب کو جو نقصان اس حادثہ سے پہنچا ہے اس کو ناقابل تلافی قرار دیتا ہے، نیز مسلمانوں کی تعلیم و اصلاح اور علوم قدیمہ کے احیاء کے لئے جن یادگار خدمات سے ان کی زندگی کی تاریخ لبریز ہے ان کی نامتائی و عدم تکمیل پر اشکبار و غم آلود ہے۔

محرم: مولانا ابوالکلام آزاد۔ مؤید: حکیم محمد اسماعیل صاحب رئیس پریسیڈنٹ انجمن معین الاسلام۔

(۴) نظم (۱) مولوی خلیل عرب (۲) حافظ وجیہ الدین صاحب (۳) مولوی محمد مسلم صاحب عظیم آبادی (۴) حکیم رکن الدین صاحب دانا۔

(۵) تجویز نمبر ۲ و ۳: یہ جلسہ دولت علیہ آصفیہ دکن (خلد اللہ تعالیٰ)..... سے درخواست کرتا ہے کہ جو گراں قدر وظيفہ علامہ مغفور کی زندگی میں ان کی علمی خدمات کے لئے جاری تھا۔ وہ اب بھی کسی مناسب و منتظم عنوان پر کسی ایسے علمی کام کے لئے جاری رکھا جائے جو ان کی یادگار میں تجویز پائے۔

محرم: جناب صدر

(۶) تجویز نمبر ۴: یہ جلسہ قوم کا اولین فرض سمجھتا ہے کہ علامہ مغفور کی قیام کی یادگار کے قیام کا انتظام کرے اور اس جلسہ کے خیال میں اس کے لئے بہترین تجویز دار المصنفین کی ہے جو آخر ایام میں مولانا کے پیش نظر تھی۔

محرم: مولانا ابوالکلام آزاد۔ مؤید: مولانا حکیم عبدالرؤف

(۷) تجویز: یہ جلسہ تمام اعیان ملت سے درخواست کرتا ہے کہ چونکہ علامہ مغفور کی سب

سے بڑی تعلیمی یادگار ندوۃ العلماء ہے جس کے لئے انھوں نے اپنی زندگی وقف فرمادی تھی، اس لئے ان کے بعد قوم کا فرض ہے کہ اس کی اصلاح و تکمیل کے کام کو زیادہ قوت اور مستعدی سے انجام دے۔

محرم: حکیم مولوی محمد ابراہیم صاحب۔ مؤید: مولوی حکیم رکن الدین صاحب دانا۔

(۸) دعاء مغفرت: مولانا ابوالکلام آزاد صاحب

(رکن الدین دانا، آنریری سکریٹری انجمن معین الاسلام کلکتہ)

(زمیندار ۲۲ دسمبر ۱۹۱۴ء سرورق)

رنگون (برما)

۲۰ دسمبر ۱۹۱۴ء کو طلبہ واسکول اسٹاف حاجی یوسف بھائی میاں مسلم اسکول کا ایک غیر معمولی جلسہ شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کی وفات پر اظہار افسوس کے لئے بصدارت جناب حاجی محمود یوسف بھائی میاں صاحب منعقد ہوا۔

سب سے پہلے محمد ابراہیم طالب العلم نے قرآن شریف کی چند آیتیں تلاوت کیں اس کے بعد مولوی عبدالرحمن صاحب (ندوی) نے علامہ موصوف کی مختصر سوانح عمری اور مولانا کی اسلامی اور قومی خدمات پر تقریر کی جس سے طلباء پر رقت طاری ہو گئی۔

مولوی مراد اللہ صاحب نے ایک پرورد تقریر میں مولانا کی وفات کو تمام عالم اسلامی کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیا۔

جلسہ میں حسب ذیل تجاویز باتفاق آرا منظور ہوئیں۔

(۱) ہم تمام طلبہ اور اسکول اسٹاف مولانا مرحوم کے پس ماندوں سے ان کی اس مصیبت میں دلی ہمدردی اور علامہ کی بے وقت موت پر اپنے قلبی رنج و قلق کا اظہار کرتے ہیں۔

(۲) قرار پایا کہ اس اسکول کی نئی بلڈنگ میں (جو عنقریب بننے والی ہے) مولانا مرحوم کی کوئی یادگار قائم کی جائے۔

(۳) قرار پایا کہ اگر معلمین ندوہ مولانا مرحوم کی کوئی یادگار قائم کریں تو ہم تمام طلبہ

واسکول اسٹاف ان کی ہر طرح امداد کریں گے اور ان کے شریک حال ہوں گے۔ چنانچہ اسی وقت جناب حاجی محمود یوسف بھائی میاں صاحب نے اپنی طرف سے مبلغ ایک سو روپیہ دینے کا وعدہ کیا۔ (۴) قرار پایا کہ مولوی حامد نعمانی کے پاس ایک پیغام تعزیت بذریعہ تار ارسال کیا جائے اور ان قرار دادوں کی نقل بغرض اشاعت اخبارات کو بھیجی جائے۔ اس کے بعد مولانا مرحوم کی مغفرت کے لئے دعا مانگی گئی اور جلسہ برخاست ہوا۔

۶۔ تعزیتی مضامین

روزنامہ زمیندار میں متعدد تعزیتی مضامین لکھے گئے چونکہ زمیندار کی مکمل فائل دستیاب نہیں، اس لئے ان کی تعداد کا تعین ممکن نہیں۔ البتہ جو مضامین دستیاب ہوئے ہیں وہ اس لحاظ سے بے حد اہم ہیں کہ یہ شبلیات میں بالکل نئی تحریریں ہیں۔ یہ مضامین دو طرح کے ہیں: چند ایک میں مضمون نگار کی صراحت ہے جب کہ چند مضامین مضمون نگاروں کی صراحت سے خالی ہیں اور کسی قرینہ سے ان کے نام معلوم نہ ہو سکے۔ تحفظ کے خیال سے یہ تمام مضامین یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

ہماری بزم کی آخری شمع بھی بجھ گئی

مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ
عاشق رسول کا ماتم

(۱)

۱۹۱۴ء کے مصائب عظمیٰ خواہ کار بارے عالم کا کچھ ہی فیصلہ کریں لیکن مسلمانوں کی علمی قسمت کا فیصلہ تو اٹھارہویں نومبر کی صبح کو ہو چکا۔ موجودہ دور مصائب و تنزل علمی نے ہمیں جو برکتیں عطا کی تھیں یقیناً ان میں بخشش اعظم اور موہب کبریٰ شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کا وجود مبارک تھا جس نے تقریباً ربع صدی تک اسلامی علوم و فنون کے دائرہ گنبد میں وہ گونج پیدا کی جس کی صدائے بازگشت یقیناً کانوں میں قیامت تک آتی رہے گی۔

مولانا کی صحت تو ۷ مئی ۱۹۰۷ء ہی کو مجروح ہو گئی تھی جس دن اتفاقاً ان کے پاؤں میں بندوق کی گولی لگی تھی اور خون کا بڑا حصہ رگوں سے بہ چکا تھا۔ چند مہینوں کے علاج کے بعد جس صحت نے عود کی وہ ماضی کا بدل نہ کر سکی۔ مدت سے مولانا کو بوا سیرخونی کی شکایت تھی۔ تین چار سال سے اس کے دورے جلد جلد ہونے لگے تھے۔

اور اسی کے ساتھ اکثر پیش بھی ہو جاتی تھی، چلنے پھرنے کی معذوری کے سبب اور امراض مذکورہ کے باعث ضعف معده شدت کو پہنچ گیا تھا۔ دو برس سے ضعف کا یہ حال تھا کہ رات دن میں صرف ایک وقت غذا رہ گئی تھی جس کی مقدار روزانہ صرف ایک پاؤروٹی کا چوتھائی حصہ رہ گیا تھا، اس اثنا میں علالت کے بڑے بڑے دورے ہوئے اور حکیم عبدالولی صاحب لکھنوی اور حاذق الملک دہلوی کے علاج و تدابیر سے افاقہ ہوتا رہا۔ اپریل و مئی ۱۹۱۴ء کے مہینوں میں ندوۃ العلماء کی جس کے مقاصد ان کی زندگی کا مطلوب تھا نا کامی و ہنگامہ آرائی نے انھیں سخت تکلیف پہنچائی تھی۔ اس کے دو مہینہ کے بعد ان کے برادر عزیز مسٹر محمد اسحاق بی اے۔ ایل ایل بی مرحوم نے جن سے مولانا کو سخت محبت تھی۔ ۵ اگست ۱۹۱۴ء کو داغ مفارقت دیا۔ اس صدمہ جانکاہ نے انھیں نہایت افسردہ کر دیا۔ تاہم علمی و قومی خدمت کا ولولہ ابھی سرد نہیں ہوا تھا، علی گڑھ اور ندوۃ العلماء کے تجربوں نے اونچی دکانوں سے بالکل بے مزہ کر دیا تھا۔ اس لئے ان کا آخری ارادہ یہ تھا کہ خود اپنے وطن اعظم گڑھ میں اپنے مقاصد کی تخم ریزی کریں۔ نیشنل اسکول جو اس شہر میں مولانا کی قومی خدمت کی سب سے پہلی ابجد تھی اس کی تجدید و استحکام اور سرائے میر میں ایک مذہبی درس گاہ کی تنظیم و ترتیب جو چند سال سے قائم ہو چکی تھی اور دارالمصنفین کی تاسیس و بنا جس کے لئے وہ تین سال سے بے قرار تھے، یہ تمام تجویزیں ان کے پیش نظر تھیں اور ان کے لئے اپنا مکان و باغ واقع اعظم گڑھ کا وقف قریب تکمیل تھا کہ عید اضحیٰ کے دوسرے دن علالت کی ابتدا ہوئی۔

یہ نومبر کی ۷ تاریخ تھی تین دن تک پیش و بوا سیر کا دورہ رہا۔ ضلع کے اسسٹنٹ سرجن کا علاج رہا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ چوتھے دن لوگوں نے طبی علاج شروع کیا۔ شہر کے ایک طبیب نے پیش کا معمولی نسخہ استعمال کرایا، نسخہ کے استعمال سے اس دن پچاس ساٹھ دست آگئے اور ایک بار اس قدر خون آیا کہ طشت کا تین ثلث حصہ خون سے بھر گیا۔ یہ جسم کی پہلی شکست تھی، اس کے

بعد ضعف برابر ترقی کرنے لگا۔

مولانا کو خود اپنی صحت سے یاس ہو چکی تھی۔ اپنے احباب اور حلقہ بگوشوں کو فوراً تار دیئے۔ افسوس کہ اس غمزدہ کے نام پونہ کلکتہ اور دہلی کے پتہ سے تار گئے۔ میں اس وقت بانکی پور میں تھا، بلا اطلاع خود دل نے زیارت کی کشش ظاہر کی۔ مولانا گذشتہ چند سالوں سے عظیم الشان سیرت نبوی کی تالیف و ترتیب میں مشغول تھے۔ بار بار علالت کے ایام میں وہ میری آمد کے منتظر تھے کہ سیرت نبوی کے اجزا اور اپنے ناتمام کاموں کو جن سے میں پہلے سے آشنا تھا میرے سپرد کر سکیں۔

لیکن آہ! جب میں ۱۵/ (نومبر) کی شام کو پہنچا تو طاقت جواب دے چکی تھی۔ سر بالیں کھڑا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ مولانا نے آنکھیں کھول کر حسرت آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اب کیا رہا؟

پھر زبان سے دوبارہ فرمایا اب کیا، اب کیا! لوگوں نے جواہر مہرہ ایک چچے میں پلا دیا تو جسم میں ایک فوری مصنوعی قوت پیدا ہو گئی اور بطور معاہدہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا ”سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے سب کام چھوڑ کے سیرت تیار کر دو۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”ضرور ضرور“

اس کے بعد ان کی حالت روز بروز بلکہ ساعت بہ ساعت نازک تر ہوتی گئی، اسہال خونی اور آخر میں صرف اسہال برابر جاری رہا، آنتوں میں خراش سے زخم ہو گیا تھا۔ غذا تمام ایام علالت میں مطلقاً موقوف رہی۔ لاغری و نحافت کا یہ حال ہو گیا کہ پیٹ اور پیٹھ میں شاید دو تین انگل کا حجاب ہو۔ طبی علاج و اہتمام جاری تھا، لیکن مولانا نے دوا کے استعمال سے قطعاً انکار کر دیا، پھر تین روز تک مطلق دوا نہیں پی۔ ۱۶/ (نومبر) کی شام کو مولانا حمید الدین صاحب بھی تشریف لائے جن کے لئے مولانا ابتدائے مرض سے منتظر تھے۔ ۱۷/ (نومبر) کی صبح کو چار بجے ان کو اور مجھے یاد فرمایا۔ زبان مبارک سے تین بار: ”سیرت، سیرت، سیرت“ کہا اور پھر انگلی سے لکھنے کا اشارہ کر کے کہا ”سب کام چھوڑ کے“ حالت جب زیادہ نازک ہو گئی تو جناب حاذق الملک اور جناب حکیم عبدالولی صاحب اور دیگر اطباء کو تار دیئے گئے۔ ڈاکٹر محمد نعیم صاحب اسسٹنٹ

سرجن وممبر میڈیکل مشن ہلال احمر مولانا کی رحلت سے بارہ گھنٹے پیشتر جون پور سے پہنچ گئے۔ انھوں نے نہایت توجہ کے ساتھ مریض کا ایک ایک عضو دیکھا اور بحالت یاس کہا کہ دماغ کے سوا اور تمام اعضا معطل ہو چکے ہیں۔ اب تدبیر بے سود ہے۔ آخر ۱۸ نومبر کی صبح کو پانچ بجے مولانا مرحوم کی روح نے آخری سانس لی۔ عصر کے وقت لاش شبلی منزل واقع اعظم گڑھ میں سپرد خاک کی گئی۔ تمام شہر اور اطراف کے مسلمان نماز میں شریک تھے۔ سرکاری عدالتیں اور شہر کے مشن اور مسلم اسکول بند کئے گئے۔

استاذ بزرگوار! جا اور سایہ رحمت میں آرام کر۔ دنیا تجھ کو بہت ڈھونڈے گی لیکن نہ پائے گی۔ سید سلیمان (روزنامہ زمیندار لاہور۔ یکم دسمبر ۱۹۱۴ء)

آہ! شبلی

(از صفی الدولہ حسام الملک نواب سید محمد علی حسن خاں آنریری سکریٹری انجمن اصلاح ندوہ)
افسوس صد افسوس ۱۸ نومبر کی صبح کو حضرت علامہ شبلی نعمانی نے وفات پائی۔ وہ آفتاب علم جس کی روشنی نے ہندوستان کے ہر گوشہ کو روشن کر رکھا تھا ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ہم مولانا کے اعزہ و اقربا کے ساتھ دل سے شریک ماتم والم ہیں اور بعض ناشدنی مجبوریوں اور اپنی علالت کی وجہ سے مولانا کے پاس موجود نہ ہونے پر سخت متاسف و غمگین ہیں۔
وماتشاؤن الا ان یشاء اللہ رب العالمین۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے کنار رحمت میں جگہ دے۔
اس ناقابل تلافی نقصان کے صدمہ میں ہم کو اور قوم کو خدا پر بھروسہ کر کے پورے صبر و استتفال سے کام لینا چاہئے اور یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مردان خدا کے فانی وجود کے ساتھ ان کی ارواح مقدسہ فنا نہیں ہوا کرتیں اور ایک زندہ قوم کے رہنماؤں کے وجود ظاہری کے ساتھ ان کے علمی اور عملی اور قومی اور مذہبی کارناموں پر زوال نہیں آیا۔

ہرگز نہ میر دانکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

بلکہ زندہ قوموں کے افراد میں اس قسم کے حوادث عظیمہ ان کی غیرت، حمیت، مستعدی اور سرگرمی میں ایک پر زور اسٹیم اور ولولہ پیدا کر دیتے ہیں۔

یہ بات عالم آشکارا ہے کہ مولانا آغاز انجمن ندوۃ العلماء سے اپنی آخری انفاس مستعار تک ندوہ کی آبیاری میں ہمہ تن مشغول رہے اور اپنے ایثار نفس کا بے نظیر نمونہ قوم کی تقلید کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ مولانا کی شیفنگی ندوہ کے ساتھ لیلیٰ و مجنوں کے عشق سے بھی بڑھی چڑھی تھی۔ درحقیقت اسلامی درس گاہ ندوہ کی بلند اور سربہ فلک دیواریں جس مضبوط اور پائیدار اصول اور مقاصد پر اٹھائی گئی تھیں خود زمانہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ قومی اور اسلامی ترقی کا مدار کلیۃً انھیں اصول و مقاصد پر ہے پس مولانا کے احباب تعلیم یافتگان دارالعلوم اور سب سے بڑھ کر قوم کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ بلا ایک لمحہ زائل کئے ہوئے اپنی دو چند بلکہ سہ چند و چہار چند قوت سے کام لے کر اس وقت تک دم نہ لے جب تک ندوہ اور اس کا دارالعلوم اپنے اصلی اور بنیادی اصول و مقاصد پر استحکام کے ساتھ قائم نہ ہو جائے۔ مجھ کو امید ہے کہ قوم اپنے آثار حیات اور احساسات کا کامل ثبوت دے گی۔ چونکہ اس وقت صدمات قلبی کی وجہ سے نہ قلم اختیار میں ہے نہ زبان پر قابو ہے اس لئے میں اس مختصر قومی عرض داشت کو دعا پر ختم کرتا ہوں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنے کسی برگزیدہ، روشن ضمیر اور دقیق النظر بندے کو کھڑا کر دے کہ وہ مولانا کی انتہائی آرزو اور قوم کی حقیقی فلاح و بہبود اور ندوہ کے بنیادی اصول اور مقاصد کی سرپرستی پر آمادہ ہو کر اس قحط الرجال کے زمانہ میں قوم کی مایوسی اور افسردگی کو سراپا یقین اور امید سے بدل دے، اور موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے ایک شاہ راہ ترقی کھول دے۔ واللہ ولی التوفیق واللہ

المرجعہ الماب

(روزنامہ زمیندار، ۱۰ دسمبر ۱۹۱۳ء)

شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی مرحوم

(نوشتہ) پروفیسر فیروز الدین مراد بی اے، ایم ایس سی۔

علامہ شبلی کی بے وقت موت ایک اندوہ ناک قومی ماتم ہے۔ مرحوم کی وفات سے

مسلمانان ہند ایک عالی شان دماغ، طرز جدید کے ایک قابل مصنف، اعلیٰ پایہ کے اسلامی مورخ اور محقق سے محروم رہ گئے ہیں۔ علامہ موصوف کا نعم البدل ملنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ہمیں اس وقت آپ کی قومی خدمات اور علمی مساعی جیلہ کا استحصال کرنا مقصود نہیں ہے کیوں کہ مرحوم کے حین حیات ہی میں ایک عالم ان کی کامیابی کا معترف اور حسن کارگزاری کا مداح تھا۔

علامہ شبلی پرانی طرز کے ایک جید عالم اور باعمل بزرگ تھے۔ خداداد ذہانت اور علمی شغف کے علاوہ ایک نفاذ طبیعت اور مجتہدانہ علمی مذاق پایا تھا۔ آپ کو رائے تقلید کے قائل نہیں تھے۔ آپ کی علمی کامیابی کا بڑا راز آپ کی اجتہادی تنقید، ان تھک محنت اور ایک نکتہ رس ذہن کی لگا تار کوششوں میں مضمر تھا۔ آپ جیسے ایک بلند پایہ عالم کی موت حقیقی معنوں میں عربی مثل کے مطابق موت العالم موت العالم ایک جہاں کی موت ہے۔

آپ کا دماغ گونا گوں وجدانات علمی کا خزانہ تھا۔ نہ صرف اسلامی تاریخ اور علم کلام سے آپ کو دلچسپی تھی بلکہ آپ ایک اعلیٰ درجہ کے عربی فارسی کے عالم تھے۔ بالخصوص فارسی علم و ادب اور نظم سے آپ کو بے انتہا الفت تھی۔ اور ان پر کامل عبور تھا۔ نامناسب نہ ہوگا اگر ہم علامہ موصوف کی مختلف النوع تصانیف اور تالیفات کا یہاں اجمالی ذکر کر دیں اور اس کے ساتھ ہی آپ کی سبق آموز زندگی کے مختصر سوانح بھی بیان کر دیں۔

۱۸۸۳ء میلادی میں جب کہ مدرسۃ العلوم کالج کی جماعتوں میں صرف محدودے چند طلبہ پڑھتے تھے۔ مولانا شبلی، مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی اور دیگر اساتذہ وقت سے فارغ التحصیل ہو کر علی گڑھ میں بہ عہدہ پروفیسری مقرر ہوئے۔ متواتر ۱۶ برس تک آپ نے کالج کی خدمت کی اور جب آپ نے کالج سے کنارہ کشی کی تو آپ ایک مستند عالم اور شہرہ آفاق مصنف تھے۔ جن کی زبردست اور باتر تیب تحریر کا جادو مسلمانان ہند کے دلوں کی تسخیر کر چکا تھا۔ ہمیں اس وقت ان واقعات کے اوپر جن کے باعث مولوی شبلی صاحب کو کالج سے علاحدگی اختیار کرنی پڑی، قلم اٹھانا مقصود نہیں ہے۔ کالج سے علاحدہ ہونے پر جیسا کہ ایک زمانہ جانتا ہے کہ آپ نے اپنا سارا روز اور وقت ندوۃ العلماء، لکھنؤ کی تنظیم اور اصلاح میں صرف کیا۔ لیکن افسوس ہے کہ آخری وقت میں ایسے تنازعات شروع ہو گئے جن کا صدمہ ایک حد تک مولانا کی ہلاکت کا باعث ہوا

ہے۔ گو عمر طبعی اور صحت کی خرابی بھی جو کہ کئی سالوں سے نام نہاد کشمیر جنت نظیر کی سیر سے لاحق ہوئی تھی۔ علاوہ ان کے بھائی مسٹر محمد اسحاق بی اے کی بے وقت موت کا صدمہ ان کی فوری موت کے باعث قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

سب سے پہلی تصنیف جو آپ نے دنیا کے سامنے پیش کی وہ رائل ہیروز آف اسلام کے مجوزہ سلسلہ کی پہلی شاندار کتاب المامون تھی لیکن اس سے پہلے ایک مختصر رسالہ بعنوان مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم ان کی شہرت کا منامن ہو چکا تھا۔ یہ رسالہ مع دیگر اسی قسم کے اور مضامین کے رسائل شبلی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ آپ کی تیسری تصنیف سیرۃ العمان ہے، جس میں آپ نے فقہ حنفی کی فضیلت زبردست دلائل اور براہین سے روز روشن کی طرح ثابت کر دکھائی ہے اور بتا دیا ہے کہ صرف یہی مذہب تمدن کے موافق ہے۔ نیز احادیث کے متعلق اصول درایت پر ایک عالمانہ تنقید لکھی ہے۔ اس کے بعد الفاروق شائع ہوئی جس کے متعلق کسی ریمارک کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس کی شہرت مولانا کی تمام تصانیف سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ الکلام ہر دو حصص اور الغزالی اپنی نوعیت کی ممتاز تصانیف ہیں۔ سوانح مولانا روم کے اوپر ایک عالمانہ تبصرہ، اب ہم ایک ایسی تصنیف کا تذکرہ کرتے ہیں جس کے متعلق مبصرین کی رائے ہے کہ مولانا شبلی کی محنت رائگاں اور اکارت گئی ہے اور جو بہتر تھا کہ مولانا شبلی نہ لکھتے ہمارا مفہوم موازنہ انیس و دہیر سے ہے۔ نویں تصنیف شعرا لجم کی ضخیم چار جلدیں ہیں جس میں فارسی ادب پر نہایت جانفشانی سے مکمل بحث کی گئی ہے۔ سب سے آخری تصنیف علامہ مرحوم کی مجوزہ سیرت نبوی کی چار جلدیں ہوتیں اگر موت کا زبردست ہاتھ انہیں ہمارے درمیان میں سے اچک نہ لے جاتا۔ سیرت نبوی کے مجوزہ چار جلدوں کے مضامین مختصر ایہ تھے۔ ایک جلد میں یورپی معترضین کا جواب، دوسری جلد میں سوانح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ تیسری جلد میں تبلیغ رسالت کا مفصل ذکر اور چوتھی جلد میں قرآن کریم کے متعلق ایک مکمل بحث۔

علاوہ ان تصانیف کے مولانا کے محققانہ مضامین جو اس نادر رسالہ الندوہ میں تطبیق فلسفہ جدید و قدیم اور موازنہ معقول و منقول کی غرض سے شائع ہوتے رہے ہیں، بجائے خود اپنے مصنف کے لئے ایک عمدہ یادگار ہیں جو صحیح علمی مذاق ان مضامین میں پایا جاتا ہے، شاید ہی

ہندوستان کے کسی دوسرے رسالہ میں نظر آسکے ماسوائے ان مضامین کے۔ مولانا کا فارسی اور اردو کلام فارسی اور اردو نظم میں ایک اعلیٰ رتبہ کا مستحق ہے۔ بوستاں کی قسم کی چھوٹی چھوٹی نظموں کا سلسلہ جو تمام اردو اخبارات و جرائد کے ذریعہ اشاعت پذیر ہوتا رہا ہے اور جس سلسلہ کی آخری نظم مرحوم کی وفات سے دو تین دن قبل الہلال میں شائع ہوئی تھی، اپنی مثال آپ ہے۔

علامہ شبلی نے اردو زبان میں ایک نئی روح پھونک دی ہے اور آپ کی وفات سے مشکل یہ آن کر پڑی ہے کہ ان کے کام کو جاری رکھنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی خوش بختی سے اس میں ایک ایسا جید عالم موجود ہے کہ اگر ان کی توجہ اس کام کی طرف مبذول ہو جائے تو ہمیں یقین واثق ہے کہ وہ اس کام سے بخوبی عہدہ برآ ہو سکیں گے، ہماری مراد مولانا شبلی کے ہم عصر شمس العلماء مولانا خلیل احمد صاحب ہیں جو علی گڑھ کالج اور مدرسہ کی خدمت گذشتہ پینتیس سال سے نہایت محنت اور جانفشانی سے کر رہے ہیں اور جن کا وجود میرے نزدیک علی گڑھ کالج کے لئے رحمت اور برکت کا باعث ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اور میری یہ امید بے جا نہ ہوگی کہ مولانا خلیل احمد صاحب ضرور دنیا کو اپنے تبحر علمی اور وسیع معلومات اسلامی سے مستفید فرمائیں گے اور جو خزانے آج تک ان کے سینہ میں محفوظ ہیں اب ان کو تشنگان علم کے فائدہ کے لئے عام کر دیں گے۔“

(روزنامہ زمیندار لاہور ۲۰ دسمبر ۱۹۱۲ء ص ۵)

مضمون نگار نے علامہ شبلی کی تصنیف موازنہ انیس و دیر پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے ایڈیٹر زمیندار مولانا ظفر علی خاں نے اس پر اختلافی نوٹ لکھا ہے کہ:

”زمیندار۔ علامہ شبلی کی کتاب (موازنہ انیس و دیر) کی نسبت جو رائے اس مضمون میں ظاہر کی گئی ہے یہ وہی رائے ہے جو عہد قدیم میں کتاب الموازنہ بین ابی تمام والحبیب و سحتری کی نسبت ظاہر کی ہے لیکن یہ امر اہل فن سے مخفی نہیں رہ سکتا کہ ادبیات عرب میں جیسا پایہ اس کتاب کا ہے وہی منزلت ادبیات اردو میں موازنہ انیس و دیر کو بھی حاصل ہے۔“ (ایضاً)

آفتاب علم غروب ہو گیا

شمس العلماء شبلی نعمانی

خوش درخشید و لے دولت مستعجل بود

فرشتہ قضا نے ہم سے اسلام کی عظمت چھین لی، مگر ہم بے دل نہ ہوئے۔ اس لئے کہ ہم میں اس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے شبلی موجود تھا۔ قرآن کی حکومت چھین لی، مگر ہم کو تشویش نہ ہوئی، اس لئے کہ اس کا خضر طریقت شبلی موجود تھا۔ فاروق اعظم کی سطوت چھین لی، مگر ہم پر بے دلی نہ چھائی اس لئے کہ الفاروق کا سکہ بٹھانے والا شبلی موجود تھا۔ مامون عباسی کی علمی برکتیں چھین لیں مگر ہم مضطر نہ ہوئے اس لئے کہ المامون کا مصنف شبلی موجود تھا۔ امام اعظم ابوحنیفہ نعمان کو فی کا علم و فضل چھین لیا گیا مگر ہم ناامید نہ ہوئے کہ سیرۃ النعمان کا صورت گر شبلی موجود تھا۔ امام غزالی کے برکات و فضائل چھین لئے گئے مگر ہم وقف یاس نہ ہوئے، اس لئے کہ الغزالی کے زمانے کا تعارف کرانے والا شبلی موجود تھا۔ مولوی روم کا فلسفہ چھین لیا مگر ہم پر اضطراب طاری نہ ہوا، اس لئے کہ فلسفے کا سوانح نویس شبلی موجود تھا۔ علمائے اسلام کا ہم کلام چھین لیا گیا، مگر ہماری ہمت نہ ٹوٹی، اس لئے کہ الکلام کا شارح حقیقت شبلی موجود تھا۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کی جاہ و جلالت چھین گئی، مگر ہم بے حوصلہ نہ ہوئے، اس لئے کہ اس کے آثار و وقار بتانے کو شبلی موجود تھا۔ خلافت امویہ کا تمدن چھین گیا، مگر ہم نے جزع فزع نہ کیا اس لئے کہ الانتقاد کا بدائع نگار شبلی موجود تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فیض مجسم و رحمت عام زندگی پر اعتراضات ہو رہے تھے مگر ہم نے اعتنا نہ کیا اس لئے کہ سیرت نبویؐ لکھنے کے لئے شبلی کا قلم موجود تھا۔ انیس و دہیر کی ادبی قابلیت ہم سے چھین گئی مگر ہم پر اثر نہ پڑا، اس لئے کہ ان کی قابلیت کا موازنہ کرنے والا شبلی ہم میں موجود تھا۔ بایزید کی روشن ضمیری ہم سے چھین گئی مگر ہم نے محسوس نہ کیا اس لئے کہ شبلی ہم میں موجود تھا۔ اس وقت نہ صرف شبلی کے ماتم دار اس کے فضائل کے ماتم دار نہیں بلکہ اسلام کے سگووار ہیں۔ علوم عرب کے سگووار ہیں، غزالی و رازی کے سگووار ہیں۔ اس لئے کہ شبلی کی وجہ سے یہ سب زندہ

تھے اور خدا کرے اب بھی کوئی دوسرا شبلی اٹھے کہ ان سب کی حیات جاوید کو صدمہ نہ پہنچنے پائے۔

(۲)

علامہ شبلی کی علمی زندگی اپنے تمام انوار تحقیق میں رایت افراز سر بلندی رہی، سب سے پہلے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائف میں ایک مختصر عربی کتاب جس کا نام بدء الاسلام ہے اور جو مدرستہ العلوم علی گڑھ کے نصاب دینیات میں اب تک شامل ہے۔ مرحوم کی آخری تالیف بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت ہی تھی جس کی متعدد جلدیں مکمل ہو چکی ہیں، مگر ہنوز اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ یعنی اس پاک زندگی کی ابتداء بھی رسول اللہ ہی پر ہوئی اور اسی ذکر خیر پر انتہا بھی ہوگئی۔ آغا ز عمل بھی اسی نام پر ہوا اور حسن انجام کے لئے بھی تادم مرگ یہی کام تھا۔ ہوا الاول، ہوا الآخر۔

کون ہے جو اس تابناک اور درخشندہ انجام کا آرزو مند نہ ہوگا مگر تقدیر نے یہ خصوصیت گویا شبلی ہی کے لئے مخصوص کر رکھی تھی۔

قسمت نگر کہ کشتہ شمشیر عشق یافت

مر گے کہ زاہداں بدعا آرزو کنند

خاک پاک ہندوستان نے شاہ ولی اللہ جیسے محدث بھی پیدا کئے ہیں جو علم اسرار الدین کے وضع تھے۔ اسی آب و گل سے علامہ صنعانی کا بھی خمیر تھا جن کی مشارق الانوار آج تک اشراق سنت و منبع نور مانی جاتی ہے۔ قاضی عبدالمتقندر بھی یہیں کے تھے جن کے ”لامیۃ العجم“ کا آج تک اہل عرب سے بھی جواب نہ ہوسکا۔ شیخ شہاب الدین بھی یہیں کے تھے جن کی کتاب الارشاد شرح ملا جامی کا ماخذ تھی۔ محمد بن عبدالرحیم اصولی بھی اسی خاک سے پیدا ہوئے تھے جن کو علمائے شام نے علامہ ابن تیمیہ کے مقابلے میں اپنا پیشوا مانا تھا۔ سید مرتضیٰ بلگرامی مؤلف تاج العروس بھی اسی ارض مقدس کے تھے جن کو علمائے مصر اس وقت تک اپنا استاذ تسلیم کرتے ہیں، جو زبانی و ضیائے برنی بھی یہیں کے تھے جن کے تاریخی کمالات کا دانا یاں فرنگ تک کو اعتراف ہے، لیکن ساری انفرادی قابلیتیں تھیں جن کی جامع شاید ہی کوئی ایسی ایک شخصیت ہوئی ہو۔

علامہ شبلی کی ذات میں ان تمام فضائل و برکات کو جمع کر کے قدرت کا ملکہ کو یہ ثابت کرنا تھا کہ قرآن کی یہ ہدایت واقعی میں راست و درست ہے کہ ان ابراہیم کسان ائمہ یعنی ابراہیم ایک شخص نہ تھا، ایک قوم تھا۔ اس لئے منہج دین ابراہیمی (شبلی) بھی ایک فرد نہ تھا، ایک پوری قوم کے روشن ترین قوائے علمیہ کا جامع تھا۔ جو افسوس ہے کہ اب منتشر ہو گئے اور بڑا افسوس ہے کہ انتشار کے بعد ان کے فنا ہو جانے کا خطرہ بھی دامن گیر ہے۔

(۳)

زوال اندلس کی مرثیہ خوانی ابن الترمذی نے کی تھی۔ سقوط بغداد کے مرثیہ نویس سعدی تھے، لیکن اس حالت اضطرار میں ہم قلم کہاں سے لائیں، وہ دل و دماغ کہاں سے لائیں کہ مرگ فاجعہ شبلی کی تشریح کر سکیں جو حادثہ اندلس و بغداد سے کہیں زیادہ دردناک ہے۔ اس لئے کہ یہ شخص واحد کی ذات نہیں ہے، یہ اس قوم کی مزید مرگ ہے جس کی زندگی ہمیشہ علم سے ہی قائم رہی اور وہی علم حیف ہے کہ مفقود ہو رہا ہے ہم سب اس وقت مستحق تعزیت ہیں اور ہم تو کیا تمام دنیا کے اسلام اس عزاداری کی ہم سے زیادہ مستحق تعزیت ہیں، لیکن مسلمان تو پیدا ہی اس لئے ہوتے ہیں کہ اپنے جواہر پاروں کو ایک ایک کر کے کھو تے رہیں اور ان کو روتے رہیں۔

وبشیر الصابرين الذين اذا اصابتهم مصيبة قالوا انا لله وانا اليه راجعون.

یعنی ان ثابت قدموں کو بشارت دو جنہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے، کہتے ہیں ہم اللہ ہی

کے لئے ہیں اور اللہ ہی کے پاس یہاں سے پھر جانے والے ہیں۔

در دلم بود کہ بے دوست نما منم ہرگز

چہ تو آں کرد کہ سعی من و دل باطل بود

(۴)

شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کی ساری زندگی علم میں گذری، تالیف و تصنیف میں گذری۔ ابتداء سے ان کا یہی مشغلہ تھا اور انتہا تک یہی قائم رہا۔ وہ علم کے لئے پیدا ہوئے، علم ہی میں زندگی بسر کی جب تک جئے علم کے لئے جئے اور جب مرے تو اس وقت بھی علمی مسائل ہی ان کے پیش نظر تھے۔

ان کے علمی شغف و انہماک کا یہ حال تھا کہ بلاذری کی کتاب (الاشراف علی تراجم الاشراف) کے بعض اقتباسات ان کی نظر سے گزرے، دریافت سے معلوم ہوا کہ دنیا بھر میں صرف اس کا ایک نسخہ کتب خانہ قسطنطنیہ میں موجود ہے۔ یہی کتاب تھی اور اسی کا شوق مطالعہ تھا جو ان کی سیاحت روم و شام و مصر کا باعث ہوا۔ وہ دوبارہ پھر سفر کے خواہش مند تھے۔ ۱۹۰۶ء میں مستشرقین فرنگ کی کانفرنس الجزائر میں ہوئی تھی، جس میں مسلمانوں کی طرف سے سرگروہ احرار مصر (فرید بک) شریک ہوئے تھے اور علامہ شبلی کو بھی موسیو جورنار کی جانب سے شرکت کی دعوت موصول ہوئی تھی، وہ خود بھی جانے کو آمادہ ہو گئے تھے کہ دانا یاں مغرب سے علوم عرب کی نسبت مبادلہ خیال ہوگا مگر جب یہ معلوم ہوا کہ کانفرنس کی تمام تقریریں فرانسیسی زبان میں ہوں گی، عربی میں نہ ہوں گی تو ناچار فسخ عزم کرنا پڑا۔ اس لئے کہ علامہ مرحوم گوا یک حد تک فرانسیسی سمجھ لیتے تھے مگر اس زبان میں تکلم پر قادر نہ تھے۔

انہیں جو وظیفہ ملتا تھا وہ تقریباً سب کا سب کتابوں کی خریداری میں صرف ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ان کی بیوی کے علاج میں ایک معتد بہ رقم خرچ ہو گئی، ان کو سخت افسوس ہوا کہ فلاں فلاں عربی کتابوں کی خریداری میں یہ رقم کیوں نہ صرف ہوئی جو یورپ نے ابھی ابھی شائع کی ہیں۔ قبض شدید ان کو اکثر لاحق رہتا تھا، اجابت کو جاتے تھے تو اس وقت بھی کوئی نہ کوئی فلسفی کتاب ساتھ لیتے جاتے تھے کہ وقت مطالعہ سے فارغ کیوں گزرے۔ علامہ ابن جنی کی کتاب الخصایص انہیں ایک بار دستیاب ہوئی۔ یہ فن تصریف کی پہلی کتاب ہے جو خاص وضع فن کی تالیف ہے اور ہنوز کہیں نہیں چھپی ہے۔ مرحوم کو اگرچہ اس فن سے کچھ ایسی دلچسپی نہ تھی مگر ایک ہمہ گیر دماغ بانیان علوم کے نتائج تحقیق سے کیوں کر بے نیاز ہو سکتا ہے۔ اس کتاب کی نقل لینے میں ان کے بے شمار روپے صرف ہوئے۔ اس پر بھی وہ خوش تھے کہ ایک بڑا خزانہ پھوٹی کوڑیوں کے مول مل گیا۔

مسیحی فاضل جو رجبی زیدان آفندی ایڈیٹر الہلال مصر نے جب تاریخ التمدن الاسلامی کی تدوین شروع کی تو اسلامی قانون خراج (عہد خلافت عباسیہ) کی نسبت اسے مصر و شام و یورپ کے کتب خانے بھی کوئی مدد نہ دے سکے۔ علامہ مرحوم کو خط لکھا اور انھوں نے ہمارے سامنے جعفر بن قدامہ کی کتاب جو خاص اسی عنوان پر تھی بھیج دی۔ ابن قدامہ خلافت عباسیہ کا میرنشی تھا اور

سلطنت نے خود اس سے اپنے ممالک محروسہ کے لئے قانون مال گذاری و نظام مالیہ مرتب کرایا تھا مگر جرجی زیدان نے اس کتاب سے بھی فائدہ اٹھانے میں خیانت کی۔ اسلامی اصلاحات و مراعات کو نظر انداز کر دیئے، البتہ نو شیر وانیوں کے بعض اصول عمل عربوں سے منسوب کر کے دکھایا کہ ہندو بست اراضی و تشخیص جمع میں یورپ نے رعایا کے لئے جو آسانیاں رکھی ہیں وہ مسلمانوں کے عہد میں نہ تھیں۔ پیرس سے ایک عرب (لیب آفندی) نے ان کو لکھا کہ عربوں کی علمی و ذہنی قابلیت تو مسلم ہے، مگر عرصہ ایجاد و اختراع میں اس قوم نے کچھ بھی کامیابی حاصل نہ کی۔ مرحوم نے اس کے جواب میں ایک نامور مصنف عرب کی قدیم تالیف (کتاب الآلات) پیرس بھیج دی جو آج تک واپس نہ آئی۔ یہ کتاب ہم نے خود دیکھی تھی۔ بہ کثرت آلات کا تذکرہ تھا جو خاص مسلمانوں کی ایجاد تھے۔ ان سب کی تصویریں بھی دی تھی اور اس فن پر بہ حیثیت فن نہایت وسیع و جامع بحث کی تھی۔

مرحوم کی قابلیت کا یورپ تک کو اعتراف تھا۔ مسٹر ڈبلیو ٹامس آرنلڈ نے سواء السبیل لکھی۔ یورپ ان کی عربی قابلیت پر مطمئن نہ ہوا۔ دعاۃ اسلام تالیف کی۔ یورپ کو اس شان تحقیق پر بھی تسلی نہ ہوئی، لیکن جب ولایت جاتے ہوئے وہ علامہ مرحوم سے سند قابلیت لکھوا کر لیتے گئے تو انڈیا آفس نے ان کو سر آنکھوں پر جگہ دی اور مجلس اعانت و استشارہ طلبہ ہند کے وہ سکریٹری مقرر کر دیئے گئے جس پر اب تک فائز ہیں۔ ایک فرانسیسی مستشرق رباعیات عمر خیام کو (مع ترجمہ فرنج) ایڈٹ کرنا چاہتا تھا۔ ایک شعر کا صحیح مفہوم اس کو صرف اس وقت معلوم ہوسکا جب علامہ مرحوم نے اس کی تشریح کی۔ مصنف مذکور نے مقدمہ ایڈیشن میں یہ پورا واقعہ نہایت شکر گذاری کے ساتھ درج کیا ہے کہ ایک ہندو سد تانی دماغ نہ ہوتا تو ایک فرانسیسی کی غلط فہمی کبھی مرفوع نہیں ہو سکتی تھی۔

(۵)

سیاسیات میں مرحوم کی آزادی ہمیشہ یادگار مانی جائے گی۔ مسلم گزٹ میں انھوں نے مسلمانوں کی پائلکس پر صرف تین نمبر لکھے اور آل انڈیا مسلم لیگ کا نظام عمل تبدیل ہو گیا۔ ان کی ولولہ انگیز نظمیں جو کشاف اور و صاف کے نام سے الہلال کلکتہ میں شائع ہوا کرتی تھیں، مسلمانوں

میں سیاسی بیداری کی سب سے پہلی اور سب سے زبردست محرک تھیں۔ فاجعہ طرابلس، مجاریات بلقان، ہنگامہ کان پور کی ذیل میں انھیں کی نظمیں تھیں جن میں عربوں کی اس تاریخی شاعری کی روح نظر آتی ہے جس کے ایک ایک شعر اور ایک بند سے رفتار زمانہ میں انقلاب آ جاتا تھا اور مظاہر ایام کی شکل و نوعیت بدل جاتی تھی۔ قومی معاملات میں ان کی راست بازی، صداقت، کبھی خاموش ہونے کو نہیں آتی تھی۔ مسلم یونیورسٹی کا جب غلغلہ بلند ہوا اور ہڑبائی نس سر آغا خاں اس کے لئے چندہ وصول کرنے کو نکلے تو سخن فہم و دقیقہ رس طبیعتوں کی مال اندیشی ہنوز اصل نکتہ پر پہنچی بھی نہ تھی کہ مرحوم نے عین جلسہ لاہور میں ایک نظم کے ذریعہ سے تشریح کر دی کہ مسلمانوں کے لئے مسلم یونیورسٹی اسی وقت سودمند ہو سکتی ہے جب اس کی انتظامی و تعلیمی عنان اختیار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ اس باب میں ان کا یہ شعر تاریخ بیداری اہل ہند میں بطور ضرب المثل استعمال کئے جانے کے قابل ہے، جس میں فرماتے ہیں:

ہمیں یک حرف از یونیورسٹی مدعا باشد

کہ ایں سررشتہ تعلیم مادر دست ما باشد

ندوة العلماء میں ان کی مشغولیت بہت دنوں تک رہی اور بہت سارے کام وہ اس ضمن میں انجام دیتے رہے۔ استبداد سے ان کو سخت نفرت تھی، تمام قومی مسائل میں اصول احتساب کے بڑی سختی سے پابند تھے اور ہم کو خوب یاد ہے کہ دہلی و کھنؤ کے اجلاس ندوة العلماء میں انھوں نے قوم کو علانیہ احتساب عمل کی دعوت دی تھی کہ لوگ آئیں ان کے کام کی تنقید کریں۔ ہر ایک صیغہ کو جانچیں اور بتائیں کہ ان سے کیا کیا کمزوریاں ہوئی ہیں۔ ان کی تلافی کیوں کر ممکن ہے اور آئندہ کن ضوابط پر کام کرنا چاہئے۔

مرحوم کی زندگی مختلف حیثیتوں کی جامع تھی اور ہر ایک حیثیت بجائے خود ایک مکمل ترین منبع انوار نظر آتی تھی۔ جس پر تبصرہ کرنے کے لئے بڑی فرصت اور کمال وقت نظر کی ضرورت ہے۔ ہم اس موضوع کو ایک مستقل سیرت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں اور اس وقت فقط اس درد دل پر اکتفا کرتے ہیں کہ

اے وہ خدا کہ ابن سینا و ابن رشد و ابو حنیفہ و بخاری ملک شاہ و عالم گیر کے بعد بھی تونے

اسلام کو بے یار و مددگار نہ چھوڑا اس نازک وقت میں بھی کہ شبلی کی موت نے حیات اسلامی کو موت کے کنارے جا لگایا ہے۔ جذبات قومیت کی بنا ہی سر پر آ گئی ہے۔ ایوان مدنیت اسلامی برباد جانے کو ہے۔ تجھ ہی پر اس وقت اسلام کا بھروسہ ہے، مسلمانوں کا آسرا ہے، تو ہی اگر اس کمزور و پیکس قوم اسلام کی مدد کرے گا تو حصول طاقت پھر بھی ممکن ہے۔

ورنہ از ضعف دریں جا اثرے نیست کہ نیست

(روزنامہ زمیندار لاہور ۲۲، ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ء)

(۶)

ان مخصوص بزرگان ملت میں جو خود مغربی تعلیم سے نا آشنا تھے لیکن قوم کے لئے وہ اس کی تحصیل فرض لازم سمجھتے تھے اور جن کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس تعلیم کی اہمیت قوم میں ثابت کی مولانا نے مرحوم کا بھی مخصوص پایہ ہے۔ وہ جس مذہبی علوم کی اشاعت و بقا کے لئے کوشاں تھے اسی اہتمام کے ساتھ وہ مغربی علوم کی نشر و اشاعت میں ساعی تھے۔

تقریباً ۱۸۸۲ء میں جب کہ علی گڑھ کالج سے ان کا ابتدائی تعلق تھا۔ انھوں نے اپنی انتہائی کوشش سے اپنے وطن اعظم گڑھ میں نیشنل اسکول کی بنیاد ڈالی۔ وہ خود علی گڑھ رہتے تھے، لیکن اس اسکول کی ترقی و اہتمام کے لئے ان کا دل ہمیشہ اعظم گڑھ رہتا تھا۔ ان کے اس زمانے کے مکاتیب و خطوط جو احباب وطن کے نام لکھے گئے ہیں اسکول کے ذکر و مباحث سے پُر ہیں۔ اس لئے کہ قوم خود اپنے ارتقاء و تنزل کا احتساب کر سکے۔ سال بسال ”موازنہ ترقی قومی“ کے اجلاس منعقد کئے۔ اس کی رودادیں تقسیم کروائیں۔

نیشنل اسکول صرف مولانا اور ان کے احباب و اعزہ کی محنت و جاں کھبی سے پرانمیری اسکول سے ہائی اسکول تک پہنچ گیا، نیشنل اسکول جب تک مولانا علی گڑھ یا اعظم گڑھ رہے برابر ترقی کرتا گیا۔ اس اثنا میں وہ حیدرآباد تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپس آئے تو ندوے کی خرچشوں نے انھیں الجھالیا، ادھر غفلت نے اسکول کو برباد کرایا۔ اس آخری اقامت میں جب مولانا تشریف لائے تو اسکول صرف مڈل تک رہ گیا۔ سرکاری اسکول صرف چالیس پچاس روپے تھی۔ بعض نا آشنا یان ملی نے نیشنل اسکول کو جارج اسکول سے بدل دیا کہ شاید یہ انتساب شرف

وافخار ہو سکے لیکن وہ یہ نہ سمجھے کہ جسم جب روح سے خالی ہو جاتا ہے تو قائم و سنجاب کی پوشاک اس میں زیب و آرائش نہیں پیدا کر سکتی۔

مولانا مرحوم صرف دو ماہ کی فرصت پاسکے۔ اس اثنا میں انھوں نے جارج اسکول کو مسلم جارج اسکول بنایا۔ اسکول کی عمارت جو بالکل ناکافی تھی، اسحاق مرحوم کے نام سے اس میں چار کمرے تیار کروائے، سرکاری امداد میں ترقی کروائی۔ ارادہ تھا کہ پھر اس کو ہائی اسکول تک پہنچا دیا جائے کہ اس اثنا میں خود بانی کار رفیق اعلیٰ سے جا ملا۔ تعجب ہوتا تھا کہ مولانا اس ضعف پیری میں کس عزم و ہمت کے ساتھ ان مشکلات پر غالب آرہے تھے۔

مولانا کی وفات کے بعد ان کے پس ماندہ احباب اسکول کی ترقی و اہتمام میں پہلے سے زیادہ ساعی و کوشاں ہیں جن میں سب سے زیادہ اول قابل ذکر مرزا محمد سلیم صاحب وکیل اعظم گڑھ ہیں۔ مرزا صاحب موصوف مولانا کے لڑکپن کے دوستوں میں ہیں اور اعظم گڑھ کے مشہور رئیس اور ممتاز وکیل ہیں۔ مولانا کے موقوفہ باغ و بنگلہ کے متصل مرزا صاحب کا باغ ہے جو کئی ہزار کی جائیداد ہے۔ اس خیال سے کہ اگر مولانا زندہ ہوتے تو باغوں کے اتصال کے سبب سے اس باغ کے وقف کی بھی تحریک کرتے۔ مولانا کی وفات کے بعد بھی اس وقت تک ان کے دل نے راحت محسوس نہ کی جب تک وہ باغ کا وقف نامہ ہاتھ میں لے کر پیادہ پاکچہری سے شبلی منزل تک نہ آئے اور خلوص و محبت کے آنسوؤں کے ساتھ کاغذ کے ٹکڑوں میں دل کے ٹکڑے ملا کر مزار مبارک کے سامنے نذر پیش نہ کیا۔

مولانا نے مرحوم ہندوستان اسلامی کی سب سے پہلی کڑی ہیں جس نے عالم اسلام کی زنجیر اخوت سے سلسلہ اتصال جوڑا۔ جنگ روم و روس میں بے انتہا کوشش و جاں فشانی کے ساتھ انھوں نے رقم کثیرہ (چندہ) قسطنطنیہ بھیجی۔ بایں ہمہ ناسزاواری وہ اسلامی دنیا پر جان دیتے تھے۔ ایوان اخوت اسلامیہ کی ایک ایک اینٹ کو وہ کاشانہ ملت کی بنیاد سمجھتے تھے، جنگ طرابلس میں عربوں کے شجاعانہ کارنامے اور ترکوں کے بہادرانہ دلولے دیکھتے تھے اور خوشی و مسرت سے جھوم جھوم جاتے تھے۔

مولوی سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ صلح طرابلس کا زمانہ تھا، شب کو دس بجے تھے۔ مجھے

اور چند احباب کو یاد کیا، لوگ بجلت تمام پہنچے، دیکھا کہ مولانا تنہا تشریف فرما ہیں، مسرت کی لہریں چہرے پر نور بن کر دوڑ رہی ہیں، ذہن مبارک سے خوشی کے نعرے مستانہ وار نکل رہے ہیں۔ سامنے تازہ الموید کے نمبر پڑے ہیں، دوسری طرف شیرینی کا طشت ہے، ہم نے خیریت سے واقعہ پوچھا فرمایا:

انور بے اور دیگر ترکی افسروں نے دولت عثمانیہ کی خدمت چھوڑ کر طرابلس کی فوجی خدمت قبول کر لی ہے اور حکومت سنوسیہ طرابلس میں قائم ہو گئی ہے۔ خوشی سے بے قرار تھا۔ تنہا لطف نہیں آتا تھا، تمہیں بھی بلا لیا۔

علامہ شبلی کی موت صرف ایک شخص کی موت نہیں، پورے خاندان کی موت ہے، اس لئے جہاں اور جس جگہ ان کا ماتم نہ ہو، تعجب ہے۔ ہندوستان کے ہر گوشے میں مولانا کی یادگار میں جلے ہوئے اور مختلف رائیں پیش کی گئیں، جس میں سب سے اعلیٰ اور ضروری یادگار سیرت نبویؐ کی تکمیل ہے، جس کے مصارف کی کفیل علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ تاج ہند جی، سی، ایس، آئی، جی، سی، آئی، ای فرماں روا بھول (خلد اللہ ملکہا وظلہا علی رؤس المسلمین) ہیں۔

۷۔ منظوم خراج عقیدت

روزنامہ زمیندار لاہور میں متعدد شعرا نے علامہ شبلی کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ منظومات اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ہیں، ان منظومات میں چند ایک نظمیں بالکل پڑھی نہ جاسکیں، انھیں مجبوراً چھوڑنا پڑا، جو نظمیں پڑھی جاسکیں انھیں یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ زمیندار ۲۲ نومبر ۱۹۱۴ء شمارے میں علامہ شبلی کی ایک تصویر شائع ہوئی ہے جس پر لکھا ہوا ہے کہ ”وہ آفتاب جو ابھی کل غروب ہوا ہے۔“ اس سے متصل آقائی محمد جواد الحسنی الشیرازی کا منظوم خراج عقیدت بعنوان ”فریاد اسلام“ شائع ہوا ہے۔ جو یہ ہے:

ہاں مسلم غم دیدہ تا کے بمنام استی ہیں صوت اذال شنو ہنگام قیام استی
تا چند بخوابی خفت در وہم شب یلدا ایں روشنی خود ہست نے بدر تمام استی

بکشائے دو چشمانت بادیدہ عبرت ہیں برباد قصور تو از دست لہام استی
 نے پایہ و نے دیوار نے خانہ و نے گلزار گلزار شد و پُر خار آتش بہ ضرام استی
 تو سر خوش صہبائی تو محو خود آرائی آں بہ کہ ہوش آئی نے وقت منام استی
 ز سر کاہت رفتہ در شکر سر خود شو از بہر خدا بر خیزد ہنگام قیام استی
 طوفان تظاول داد کشتی وطن برباد ہاں گو توبہ کشتی بان گرداب ظلام استی
 سکان بدگرسوکن فرزانه نجاتے دہ
 کشتی وطن راز انکہ ہنگامہ شام استی

۲۵ نومبر ۱۹۱۴ء کے شمارے میں زمیندار کے اسٹنٹ ایڈیٹر کی نظم شائع ہوئی ہے،
 تلاش بسیار کے باوجود یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس وقت زمیندار کے اسٹنٹ ایڈیٹر کون تھے۔ یہ نظم
 انھوں نے ۲۲ نومبر ۱۹۱۴ء کو پنجاب اسٹریٹس لائبریری میں لاہور کے جلسہ میں پڑھی تھی۔ نظم
 درج ذیل ہے:

ارہنما سامنے ہے نقش قدم شبلی کا
 آج ہر سمت ہے عالم میں الم شبلی کا
 رنج شبلی کا، قلق شبلی کا، غم شبلی کا
 اب زمانے میں نہیں کوئی مورخ ایسا
 مغنم تھا بخدا قوم میں دم شبلی کا
 پاشکتہ تھا مگر علم کے ہر میدان میں
 آگے پڑنے سے نہ رکتا تھا قدم شبلی کا
 تادم مرگ تصانیف میں مصروف رہا
 نہ چھٹا ہاتھ سے شبلی کے قلم شبلی کا
 خبر مرگ سے دل ہو گیا ٹکڑے ٹکڑے
 بے طرح آ کے پھٹا قوم میں ہم شبلی کا
 داغ فرقت نہ مٹائے سے مٹے گا ہرگز
 کشور دل میں چلے گا یہ درم شبلی کا
 قوم کو علم کی دولت سے کیا مالا مال
 اٹھ گیا تھا جو ذرا دست کرم شبلی کا
 جھک کے چلتا تھا تواضع کے سبب سے کل تک
 دم کے ساتھ آج گیا آہ وہ خم شبلی کا

اس کے اک کاغذ تاریخ میں ہیں لاکھوں جام
 سامنا کر نہیں سکتا کبھی جم شبلی کا
 ذکر تاریخ میں اس کا یہ ہے تاریخ نویس
 جم میں بڑھ چڑھ کے ہے اجلاں و حشم شبلی کا

رتبہ کس طرح سے اعظم نہ ہوا اعظم گرٹھ میں جب ہوا خوبی قسمت سے جنم شبلی کا
اس کی تصنیف کا بیٹھا ہے جہاں میں سکھ مدح گستر ہے عرب اور عجم شبلی کا

آج تک گزرے ہیں دنیا میں مورخ جتنے مرتبہ ان میں کسی سے نہیں کم شبلی کا
نظر آتا نہیں تاریخ کا مرد میدان کون پورا کرے اب کار اہم شبلی کا
قوم میں کوئی نہیں اس کا اٹھانے والا رہ گیا بس یوں ہی قرطاس و قلم شبلی کا
قوم میں اہل کوئی تو بتادو ہم کو کس کو تفویض کریں طبل و علم شبلی کا
کارناموں کی نہ کیا اس کے کریں گے تقلید مرثیہ پڑھ کے چلے جائیں گے ہم شبلی کا

کہتی ہے ہمت مرداں کہ چلو اور بڑھو
رہنما سامنے ہے نقش قدم شبلی کا

روزنامہ زمیندار یکم دسمبر ۱۹۱۲ء کے شمارے میں آہ! شبلی کے عنوان سے مولوی
سید نواب علی ایم اے پروفیسر بڑودہ کالج کی تعزیتی نظم شائع ہوئی ہے۔ علامہ شبلی سے ان کے
گہرے مراسم تھے۔ انھوں نے یہ نظم میرزا غالب کی زمین میں کہی ہے۔ نظم حسب ذیل ہے:
کرنا نہیں اے ملک الموت تقاضا کوئی دن اور شبلی کو ابھی چھوڑ خدا کوئی دن اور
پھر کس کے قلم میں ہے یہ قدرت کہ لکھے گا سیرت کو تو ہو جانے دے پورا کوئی دن اور
صد حیف کہ سنتا ہی نہیں تو تو کسی کی فرمان خدا ٹل نہیں سکتا کوئی دن اور
ہیکل کو سلیمان نے تھا اس طرح بنایا مرکز بھی عصا کا تھا سہارا کوئی دن اور
یوں کس نے چھپایا ہے اسے خاک میں افسوس شبلی بھی وہی رنگ دکھاتا کوئی دن اور
مانا کہ بہت شاق تھی اسحاق کی فرقت تم قوم سے کرتے نہ کنارہ کوئی دن اور
سب سے نفرت سہی اور خلق سے وحشت ندوہ کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت میں ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

علامہ شبلی کو اکبر الہ آبادی سے خاص تعلق تھا۔ انھوں نے بھی زمیندار میں تعزیت کے دو

اشعار لکھے ہیں:

لفظوں میں اجتماع نہ معنی میں نور ہے ویران آج کوچہ بین السطور ہے
شبلی کا خامہ صفحہ ہستی سے اٹھ گیا اب مد آہ ولوح دل ناصبور ہے
آغا شہر لکھنوی کی بھی ایک تعزیتی نظم روزنامہ زمیندار ۳ دسمبر ۱۹۱۴ء کے شمارے میں
شائع ہوئی ہے۔ فرماتے ہیں:

اے شبلی اے گروہ افاضل میں نامور افسوس سب کو چھوڑ گئے داغ بر جگر
ماتم بپا ہے حلقہ ارباب علم میں کیا ہو رہا ہے ہند میں تم کو بھی ہے خبر
مانا کہ خلا مرجع ارباب فضل ہے تم نے ابھی سے باندھ لی کس واسطے کمر
دل سوز دین حق جو تمہیں یاد کرتے ہیں ہرنالہ جگر سے نکلتے ہیں کچھ شر
مشتاق سیرت نبوی ساری قوم تھی اے ذی کمال و عالم تحریر و خوش سیر
اب وہ کتاب معرض تعویق میں رہی ہر سطر جس کی چاہتی ہے وسعت نظر
مداح ایک خلق ہے حسن کلام کی رکھتے تھے وعظ و پند تمہارے بہت اثر
پیغام موت بھی ہے عجب بانگ بے جرس تھا وہم بھی نہ ہم کو کہ نزدیک ہے سفر
خود خدمت رسول میں تنہا پہنچ گئے
ہندوستان میں چھوڑ گئے سب کو نوحوہ گر

علامہ شبلی کے قائم کردہ نیشنل اسکول کے استاد قاضی عبدالرحمن حیرت نے بھی ایک نوحوہ

لکھا تھا جو روزنامہ زمیندار ۲۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے:

علم اور فضل کا جو جوہر روحانی تھا وہ جو ایمانی و اسلامی و قرآنی تھا
مصر اسلام کا جو یوسف کنعانی تھا وہ کہ جو رحمت حق سایہ یزدانی تھا
حیف صد حیف کہ تاریک جہاں ہوتا ہے

آفتاب اس کی تجلی کا نہاں ہوتا ہے
 بے محل تھا ابھی محفل سے ترا گھبرانا تیری کوشش کو تو باقی تھا ابھی پھل لانا
 جلوہ سیرت احمد تھا ابھی دکھلانا کیوں پسند آیا تجھے ملک عدم کا جانا
 یوں بھلا عزم فنا کوئی بشر کرتا ہے
 میرے آقا کوئی اس طرح سفر کرتا ہے
 فکر تھی نیشنل اسکول کی تجھ کو اکثر کہ سنبھل جائے کسی طرح یہ گرتا ہوا گھر
 اور سرامیر کا بھی مدرسہ تھا پیش نظر کہ چمک جائے نصیب کا کچھ اس کے اختر
 مگر افسوس کہ وہ نیرتا ہاں نہ رہا
 باغ امید کا وہ سرو خراماں نہ رہا
 اٹھ گیا آج زمانے سے ہمارا رہبر چمن دہر میں تھا جس کا نہ کوئی ہمسر
 قلم فیض و شرافت کا وہ یکتا گوہر مطلع علم و لیاقت کا وہ مہر انور
 ہائے جس مہر کا تھا دہر میں کل تک جلوہ
 آج دیکھو تو ہے وہ چرخ چہارم پہ چھپا
 ہائے اے قوم وہ اسلام کا تارا نہ رہا نائب احمد مختار کا پیارا نہ رہا
 قوم کی بزم کا وہ انجمن آرا نہ رہا ہم کو تھا جس پہ بھروسہ وہ سہارا نہ رہا
 آہ وہ رحمت یزدانی اب اس وقت کہاں
 یعنی وہ شبلی نعمانی اب اس وقت کہاں
 فلک فضل و کمالات کا وہ مہر منیر عہد غزالی و رازی کی سراپا تصویر
 یوں تو ہر فن میں تھا وہ جامع اوصاف کثیر تھا وہ تاریخ و ادب میں مگر آپ اپنا نظیر
 اس کا ہے فضل و ہنر شہرہ آفاق تمام
 مصر سے روم تک اور ہند سے لے کر تاشام

زمیندار کے ۲۴ دسمبر ۱۹۱۴ء کے شمارے میں کلکتہ کے مشہور شاعر اور علامہ شبلی کے ایک

بڑے قدرداں سید رضا علی وحشت کی بھی ایک نظم ”ماتم شبلی“ کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ یہ نظم فارسی میں ہے اور زمیندار سے حیات شبلی میں بھی نقل ہوئی ہے: نظم یہ ہے:

خوں می چکد ز ناصیہ داستان ما آہ از وفات شبلی شیوا بیان ما
ماہستگان خنجر جور زمانہ ایم نیز از متاع درد مخواه از دکان ما
اسلامیان بہ ماتم شبلی نشستہ اند ہے چور وئے کفر سیہ شد جہان ما
زین بزم آہ مورخ بالغ نظر گذشت گز رفتش برفت اثر داستان ما
آں نو بہار گلشن صدق و صفا نماند شد پائمال جور خزاں گلستان ما
آں خضر پہ نخستہ کجا رفت ظاہر است بامنزل آشنا نہ شود کاروان ما
آں نکتہ دان بزم تغزل کجا شتافت شد بے چراغ مجلس عشرت نشان ما
از قند یا رسی کہ ز بہاش می چکید ایراں بہ رشک بود ز ہندوستان ما

صدحیف آں ادیب اریب از میاں بہ رفت

وحشت نہ ماند لذت کام ودہان ما

۱۹۱۴ء میں جس وقت علامہ شبلی کا انتقال ہوا خلیفہ عبدالکیم سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں بی اے کے طالب علم تھے۔ انھوں نے ایک طویل تعزیتی نظم لکھ کر خراج عقیدت پیش کیا۔ اس کا عنوان ”پیکر شبلی میں تھی روح غزالی جاگزین“ تھا۔ یہ نظم روزنامہ زمیندار لاہور ۲۷ نومبر ۱۹۱۴ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ یہ شمارہ اس قدر بوسیدہ تھا کہ مکمل نظم پڑھی نہ جاسکی اس کا پہلا شعر یہ ہے:

آہ! علم و ہنر نے کھودیا اپنا مکیں

رہ گئی خاتم فقط غائب ہوا نقش مکیں

آخر کے چند اشعار یہ ہیں:

رنگ تصویر کہن میں بھر کے تو دکھلا گیا تیری گلکاری پہ ہر دل نے پکارا آفریں
تیری باتوں میں تھا پنہاں نشہ جام طہور تیرا ہر ایک شعر شیرینی میں رشک انگلیں

قوم کے جسم شکستہ کے لئے تھی مومیا تھی ستون ملت بیضاتری رائے زریں
صفحہ دنیا پہ گو مثل قلم یک پاتھا تو برق رفتار قلم کو پر پہنچ سکتی نہیں
بیش طوفاں صورت ساحل رہا ثابت قدم اس قدر اپنی روش کی راستی پر تھا یقین
عربدے اعدا کے کب تجھ کو مشوش کر سکے کچھ ادائی پر ہوا کس روز تو چیں برجیں

سیرت احمد لئے جاتا ہے سینے میں نہاں

سر پہ تیرے ہوگا غل رحمت للعالمیں

خلیفہ عبدالکحیم کا کلام ”کلام حکیم“ کے نام سے شائع ہوا ہے، لیکن افسوس کہ یہ نظم اس میں شامل نہیں ہو سکی ہے۔

۸- قطعہ تاریخ اور لوح مزار

روزنامہ زمیندار میں علامہ شبلی کی وفات پر متعدد قطعہ تاریخ اور لوح مزار ادباء و شعرا نے لکھے۔ ان میں اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال کے اسم گرامی بھی شامل ہیں۔

لسان العصر سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی کا مادہ تاریخ وفات

تھے مولانا شبلی بے شک اپنے علم و فن میں راسخ
ان کی موت ہے قومی ماتم سال رحلت فوت مورخ

۱۳۳۲ھ

اس مادہ تاریخ کے نیچے ایک خط شائع ہوا ہے جو غالباً اکبر الہ آبادی کے قلم سے ہے اس لئے کہ اس خط سے اس کی وضاحت نہیں ہوتی۔ چونکہ اس خط سے بھی ایک مادہ تاریخ برآمد ہوتا ہے، اس لئے یہ پورا خط یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

جناب ایڈیٹر صاحب زمیندار

سید سلیمان صاحب نے مختصر خط میں آپ کو یہ فقرہ لکھا تھا کہ ”وہ وقت نہ آئے کہ میں قوم کو قیمی کا پیغام سناؤں“ عجب اتفاق ہے کہ سید سلیمان کے اسی خیال سے مادہ تاریخ برآمد ہوتا ہے۔ بلا ترمیم و تخریج

قوم یتیم گشت آہ

۱۳۳۲ھ

یہ تاریخ سید سلیمان صاحب ہی کے الفاظ میں ہے۔ مرحوم کے اوصاف کی نسبت جو کچھ کہا جائے طبیعت سیر نہ ہوگی۔

مراسم غم کہ شدم ساکن جیم فراق

ترا چہ غم کہ بہ سوئے روضہ جنناں رفی

پروفیسر سید نواب علی صاحب کی تعزیتی نظم اوپر گزری چکی ہے۔ انھوں نے علامہ شبلی کی وفات پر ایک قطعہ تاریخ بھی کہا ہے جو یکم دسمبر ۱۹۱۴ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ فرماتے ہیں:

شد چو از دنیائے دوں سوئے جہاں شبلی آں علامہ عالی ہم
کلک نواب از پئے تاریخ فوت ”ابن رشد الہند رفتہ“ زور قلم

۱۳۳۲ھ

روزنامہ زمیندار ۲۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کے شمارے مولانا سید علی زینی استاذ ادب دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا فارسی زبان میں طویل قطعہ تاریخ وفات بھی شائع ہوا ہے۔ جو درج ذیل ہے:

دوش رفتم سوئے دارعلوم ندوہ کہ ہماں است بجا کعبہ روسانی ما
ماند اینم چہ چیز است کہ مارا بکشید جذبہ داشت مگر سورش پنهانی ما
حسرت آلود بہر سمت نظر ہا کردیم درو دیوار جزدا و ز بے جانی ما
اندریں کلبہ احزاں چہ تو آں گفت ز بود ہر درے نوحہ گر بے سرو سامانی ما
بعد از اں ز جلد دیدیم بجاک افتادہ ہمہ مصروف بزاری و عزا خانی ما
ایں گروہ طلبہ بود کہ نوحہ می کرد بر زبوں بختی خود و در پریشانی ما
گفتم اے دوش نشینان ملائک چہ بود؟ ہمہ گفتند قتاد افسر شاہانی ما

خواستم صاف بگویند جوابم آمد

کہ بگو رفت ز ما شبلی نعمانی ما

۱۳۳۲ھ

زمیندار ۳/ دسمبر ۱۹۱۴ء کے شمارے میں علامہ اقبال نے علامہ شبلی کی لوح مزار کے سلسلے میں ایڈیٹر زمیندار کے نام ایک خط لکھا ہے، جسے ایڈیٹر زمیندار نے شائع کر دیا ہے۔ خط کے الفاظ یہ ہیں:

”مندرجہ ذیل الفاظ مولانا شبلی مرحوم و مغفور کے لوح مزار کے لئے نہایت موزوں مناسب ہوں گے کہ انھیں سے ان کی تاریخ وفات کا سال بھی نکلتا ہے:

امام الہند شبلی طاب ثراہ
۱۳۳۲ھ

اس کے بعد ۱۱/ دسمبر ۱۹۱۴ء کے شمارے میں علامہ اقبال کے لوح مزار کے پس منظر میں مولوی سید علی زینبی معلم ادبیات دارالعلوم ندوہ نے لکھا کہ:

عنوان بالا سے ۳/ دسمبر کے زمیندار میں جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال پی ایچ ڈی نے علامہ مرحوم کے لوح مزار کے لئے جو تاریخ تحریر فرمائی ہے اس میں ایک مصرعہ کی کمی ہے۔ اس لئے ذیل کا فقرہ تاریخی زیادہ موزوں ہوگا:

امام الامام شبلی طاب اللہ ثراہ
۱۳۳۲ھ

اسی شمارے میں مولوی سعید الدین رام پوری نے ایک دوسرے فقرے سے تاریخ نکالی ہے جو یہ ہے:

امام زماں مولوی شبلی طاب ثراہ
۱۳۳۲ھ

ایک اور مادہ تاریخ مولوی عبدالرحمن نے درج ذیل فقرہ سے مستنبط کی ہے:

آفتاب زہر خاک
۱۳۳۲ھ

اسی شمارہ میں علامہ اقبال کا ایک اور خط شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے اپنے مصرعہ

تاریخ کی تصحیح کی ہے۔ خط یہ ہے:

میں نے جو جملہ مولانا شبلی کے لوح مزار کے لئے تجویز کیا تھا۔ وہ

اصل میں یہ ہے:

امام الہند والانزاد شبلی طاب ثراہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو خط میں نے آپ کو لکھا تھا اس میں میری غلطی سے لفظ ”والانزاد“ تحریر میں نہ آیا اور آپ کے اخبار میں بھی اسی طرح شائع ہو گیا۔ بہر حال میں اپنی فروگزاشت سے خوش ہوں کہ اس وجہ سے مولانا سید علی پروفیسر ادب دارالعلوم ندوہ لکھنؤ کو ایک ایسا تاریخی جملہ سوجھ گیا جو میرے جملے سے بہت زیادہ موزوں ہے۔

اسی شمارہ میں ایک اور لوح مزار شفی عاشر علی خاں ناطق کلانوری کا نتیجہ فکر ہے:

مولانا شبلی نعمانی نور اللہ مرقدہ

۱۳۳۲ھ

اس مادہ تاریخ پر مولانا ظفر علی خاں نے یہ نوٹ لکھا ہے کہ

”یہ مادہ تاریخ بلحاظ سلاست و سادگی متذکرہ سب جملوں سے اچھا ہے مگر اس میں لفظ اللہ کے ۳۶ عدد لئے گئے ہیں جو اصول تاریخ نویسی کے مطابق نہیں۔ اللہ کے عموماً ۶۶ عدد شمار ہوتے ہیں۔“

مسلمانان ہند کا شکریہ

علامہ شبلی کی وفات پر ان کے اعزاء کو جو تعزیتی پیغامات موصول ہوئے ان کے جواب

میں زمیندار ۱۳ دسمبر ۱۹۱۴ء میں عبدالحکیم اعظمی کا مراسلہ شائع ہوا ہے۔ مراسلہ یہ ہے:

جناب ایڈیٹر صاحب السلام علیکم

ان چند سطروں کو اپنے اخبار کے کسی گوشہ میں جگہ دے کر ممنون

فرمائیں۔

علامہ شبلی نعمانی کی وفات حسرت آیات پر مسلمانان ہند نے ان کے اعزہ واقربا سے جس دلی ہمدردی و تاسف کا اظہار کیا ہے اور مسلمانوں کی مختلف انجمنوں کی جانب سے جو تعزیت کے خطوط و تار موصول ہوئے ہیں، علامہ مرحوم کے تمام اعزہ ان کی اس سچی محبت و مخلصانہ ہمدردی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

(خاکسار عبدالحکیم اعظمی، شبلی منزل اعظم گڑھ)

سیرۃ النبیؐ

روزنامہ زمیندار میں سیرۃ النبیؐ سے متعلق متعدد تحریریں شائع ہوئی ہیں۔ تین مراسلے نورالدین تاجر چرم گجرانوالہ کے قلم سے ہیں۔ ایک نامعلوم الاسم ہے جب کہ تین مراسلے دفتر سیرت نبویؐ شبلی منزل اعظم گڑھ کی طرف سے شائع ہوئے ہیں۔ دفتر سیرت نبویؐ کے ایک مراسلہ میں جو ”وفد سیرت نبویؐ“ کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں اس وفد کی تفصیل ہے جو بیگم بھوپال کی خدمت میں گیا تھا۔ اس کا تذکرہ آئندہ صفحات میں علاحدہ ہوگا۔ دوسرے مراسلہ میں سیرۃ النبیؐ کی مختلف جلدوں اور اس کے مباحث کی تفصیل ہے۔ مراسلہ حسب ذیل ہے:

شمس العلماء مولانا شبلی مغفور کی وفات کی خبر پر ہندوستان کے تمام طول و عرض میں ماتم کیا گیا اور سب سے زیادہ ان کی آخری نام تمام تصنیف جو حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اقدس تھی، اس کا محسوس ذکر ہوا اور بہت سے احباب نے اس کے متعلق استفسارات کئے ہیں۔ اس لئے یہ چند سطریں مرسل ہیں:

مصنف نے سیرت کی پانچ جلدیں قرار دی تھیں:

- | | |
|---------|--|
| (اول) | سادہ واقعات بہ تحقیق و تنقید از ولادت تا وفات |
| (دوم) | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت منصب نبوت |
| (سوم) | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ عظمیٰ قرآن مجید |
| (چہارم) | عام معجزات صحیح و ثابت بہ روایت صحیح |

(پنجم) ردائے اعتراضات مصنفین یورپ و تنقید کتب یورپ متعلق اسلام و پیغمبر اسلام۔

اول جلد بہ تمام و کمال مصنف نے مرنے سے ایک ہفتہ قبل ختم کر دی ہے اور وہ پریس میں جانے کے لائق ہے۔ دوسری جلد کا ایک ربع کامل و صاف شدہ ہے اور بقیہ حصص مسودہ یا نوٹس ہیں جن کی ترتیب باسانی ممکن ہے۔ تیسری جلد مصنف کی زندگی میں بھی اور ان کے بعد بھی مولانا حمید الدین صاحب بی اے مدرس اعلیٰ دارالعلوم حیدرآباد برادر قریب مصنف مذکور لکھیں گے۔ مولانا ممدوح دس برس سے صرف قرآن مجید پر غور و فکر کر رہے ہیں اور مختلف رسائل اس کے متعلق ترتیب دے رہے ہیں۔ چوتھی اور پانچویں جلد سید سلیمان صاحب لکھیں گے جو مولانا ممدوح کی زندگی میں ان کے ساتھ بھی ترتیب سیرت میں شریک تھے۔ اور پانچویں جلد انھیں کے قلم سے لکھنی شروع ہوئی تھی۔

جلد اول نامی پریس کانپور میں تمدن عرب کی تقطیع، فل اسکیپ سائز پر مختلف درجات کے کاغذ پر نہایت اہتمام سے طبع ہوگی۔

چونکہ اس کتاب کی تمام ملک میں مانگ ہے۔ اس لئے شائقین سے التماس ہے کہ حسب پسند وہ ابھی سے بتعین درجہ اپنے نام کی درخواست بھیج دیں تاکہ درج رجسٹر ہو سکے اور ان کے پاس کتاب پریس سے نکلنے کے ساتھ ہی فوراً بھیجی جاسکے۔

دفتر سیرت نبوی کا مرکز وہی مقام و مکان ہے جہاں مصنف نے اپنی زندگی کے آخری دو مہینے بسر کئے، یعنی شبلی منزل اعظم گڑھ۔

تمام خط و کتابت و ارسال درخواست اس پتہ سے سید سلیمان کے نام سے کی جائے۔

(دفتر سیرت نبوی۔ شبلی منزل اعظم گڑھ)

(روزنامہ زمیندار، ۱۳ دسمبر ۱۹۱۴ء)

سیرت نبوی سے متعلق نور الدین تاجر چرم گجرانوالہ کے دواہم مراسلے شائع ہوئے ہیں۔ پہلا مراسلہ علامہ شبلی کی زندگی میں لکھا گیا ہے اس میں سیرت نبوی کی تالیف کے لئے علامہ شبلی کو نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عالم اسلام میں موزوں ترین شخص قرار دیا گیا ہے۔ اہمیت کے پیش نظر پورا مراسلہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

حضور سرور کون و مکاں کی سوانح عمری کی ضرورت
(قابل توجہ علامہ شبلی نعمانی)

خداوند تعالیٰ نے دوسرا خدا نہ پیدا کیا ہے اور نہ کبھی پیدا کرے گا کیوں کہ یہ امر اس کی شان یکتائی اور صفت احدیت کے خلاف ہے۔ ہاں اس نے ایک انسان کامل اپنی صفات کمالیہ کا نمونہ بنا کر پیدا کیا ہے اور جس طرح ایک مصفا اور وسیع شیشہ میں صاحب رویت کی تمام و کمال شکل منعکس ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس انسان کامل میں صفات الہی عکسی طور پر آگئی ہیں۔ اس انتہائی کمال کے وجود باوجود کو صوفیائے کرام کی اصطلاح میں مظہر تام الوہیت قرار دیا گیا ہے۔

وہ انسان کامل کون ہے؟ جس کی بشارتیں کتب الہامی میں موجود ہیں جس کی شان میں لولاک اور قاب قوسین ہے جو آفتاب روحانی ہے جس سے نقطہ ارتفاع کا پورا ہوا اور جود یوار نبوت کی آخری اینٹ ہے، یعنی حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔ خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرمایا ہے: انک لعلىٰ خلق عظیم یعنی اے نبی تو ایک خلق عظیم پر مخلوق و مفعول رہے اور اپنی ذات میں تمام مکارم اخلاق کا ایسا متمم و مکمل ہے کہ اس پر زیادتی متصور نہیں۔ کیوں کہ محاورہ عرب میں عظیم اس چیز کی صفت میں بولا جاتا ہے جس کو نوعی کمال پورا حاصل ہو۔ بلکہ بعض نے تو یہاں تک کہا ہے کہ عظیم وہ چیز ہے جس کی عظمت اس حد تک پہنچ جائے جو حیطہ ادراک سے باہر ہو۔

قرآن مجید میں ہے لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ تمہارے لئے پیروی کرنے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ موجود تھا۔ اخلاق اللہ سے متخلق ہونے کے بھی یہی معنی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق فاضلہ کا تتبع کیا جائے کیوں کہ آپ خلق عظیم پر مخلوق ہیں اور آپ کا وجود باوجود خیر مجسم اور مقربین سے اعلیٰ و اکمل اور الوہیت کا مظہر اتم ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ ۷

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

یہ کوئی مبالغہ نہیں کیوں کہ دیگر انبیاء علیہم السلام صفات کمالیہ میں سے خاص خاص

صفتوں کے مظہر تھے، کوئی عفت میں ممتاز تھا کوئی شجاعت میں، کوئی جاہ و حشمت میں، کوئی صبر و رضا میں اور کوئی انقطاع علی اللہ میں، لیکن وہ تمام اخلاق فاضلہ جو حقیقت انسانیہ ہے۔ مثلاً عقل و ذکا، سرعت فہم، صفائی ذہن، حسن تحفظ، حسن تذکرہ، عفت، حیا، صبر، قناعت، زہد، تورع، جواں مردی، استقلال، عدل، امانت، صدق، سخاوت، ایثار، کرم، مروت، شجاعت، علوہمت، حلم، تحمل، جمعیت، تواضع، ادب، شفقت، رافت، رحمت، خوف الہی، محبت الہی، انس باللہ، انقطاع الی اللہ۔ ان سب اوصاف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ کمال حاصل تھا جو حیطہ ادراک سے باہر ہے۔

مسلمانوں کا اخلاق فاضلہ سیکھنے کے واسطے قرآن مجید کا جاننا ضروری ہے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات سے واقفیت بہم پہنچانا بھی ضروری ہے کہ وہ اخلاق فاضلہ کس طرح ظہور میں آئے جو احکام قرآن مجید میں موجود ہیں ان کی تکمیل کر کے آپ نے عملی نمونہ بنا دیا ہے کہ احکام باری تعالیٰ کی تعمیل اس طرح کرنی چاہئے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے آپ کے اخلاق کی نسبت سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ کان خلقہ القرآن پس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کے حالات کا جاننا ہر ایک مسلمان کا فرض ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی بھی ایک عجیب زندگی ہے جس میں انسانی زندگی کے مختلف حالتوں کے تمام واقعات پائے جاتے ہیں، طفولیت میں آپ نے یتیمی اور بے کسی کی حالت میں پرورش پائی۔ شباب میں ملک و قوم کے رسم و رواج سے بیزار ہو کر تجربہ و اختیار کیا، کبھی ایک گماشتہ کی حیثیت میں تجارت کی اور پھر خود شاہ بن گئے۔ عیال داری کے حقوق ایسے ادا کئے کہ اس سے بہتر کسی کے خیال میں نہیں آسکتے۔ ایک سولجر بن کر فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لی اور آئین جنگ میں وہ مہارت تامہ دکھائی کہ آج اس ترقی و تہذیب کے زمانہ میں انہی آئین و اصول کی پیروی کی جاتی ہے۔ ایک بادشاہ بن کر ملک گیری اور ملک داری میں کمال دکھلایا۔ کبھی دشمنوں کے نرغہ میں پھنسے پھر انہی دشمنوں پر قابو پا کر ان کے قصور معاف کرنے سے اپنے رحمت للعالمین ہونے کا ثبوت دیا اور سب سے بڑھ کر فرائض ثبوت و تبلیغ کو نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے سرانجام دیا جو ان کامیابیوں سے ثابت ہوتا ہے جو حضور کو اپنی حیات میں حاصل ہوئیں

جن کی نظیر کسی اور نبی میں نہیں پائی جاتی۔

یہ سب حالات حدیث، سیر اور اسلامی تاریخ کی کتابوں میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ درج ہیں اور یہ سب کتابیں عربی میں ہیں۔ وہ لوگ بڑے خوش قسمت ہیں جو ان کتابوں کے مطالعہ سے حظ وافر اٹھاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اس کوچہ سے نابلد ہیں ان کی رہنمائی کے واسطے ضروری ہے کہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم زبان اردو میں لکھی جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ مہتمم بالشان کام کون کرے؟ خدا کے فضل سے اس گئے گزرے زمانہ میں بھی ہمارے بزرگ محترم علما و فضلاء میں کئی ایسے موجود ہیں جو اس قسم کی کتاب بڑی خوبی کے ساتھ لکھ سکتے ہیں۔ پس ہم کو ہندوستان کے بغداد یا کیمبرج کی مجلس ندوۃ العلماء کی طرف رجوع کرنا چاہئے جس کے بانی مہمانی اور روح و رواں اس کام کی اہلیت سب سے بہتر رکھتے ہیں۔ وہ کون جنھوں نے سیرۃ النعمان لکھ کر فقہ کے حقائق و دقائق بیان کئے۔ جنھوں نے الفاروق و المامون لکھ کر زمانہ کو بتایا کہ ہیر و زآف اسلام کی سوانح لکھنے کا یہ حق ہے۔ جنھوں نے الکلام، علم الکلام اور الغزالی لکھ کر بتا دیا کہ وہ نہایت اعلیٰ درجہ کے متکلم ہیں۔ جنھوں نے سوانح مولانا روم لکھ کر ثابت کر دیا کہ وہ تصوف میں بھی مہارت تامہ رکھتے ہیں اور جنھوں نے عربی زبان کا نصاب تعلیم ریوازی کر کے نہ صرف ہندوستان بلکہ عرب و ایران، مصر و روم اور کویت تک ہندوستان کے بغداد کو مشہور و معروف کر دیا۔ کون شخص ہے جو مسلمان ہو کر ان کے نام نامی سے ناواقف ہو سکتا ہے؟ مولانا مولوی شبلی صاحب نعمانی سلمہ اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح مبارک لکھنے کے واسطے ہندوستان بلکہ میری رائے میں تمام دنیا کے علما و فضلاء سے زیادہ قابلیت رکھتے ہیں۔ پس صاحب مدوح کی خدمت میں بہ ادب درخواست ہے کہ اس واسطے امید کی جاتی ہے کہ مولانا موصوف ضرور منظور فرمائیں گے۔ ایڈیٹر صاحب اخبار زمیندار کی خدمت میں التماس ہے کہ یہ درخواست اپنے اخبار میں چھاپ کر مولوی صاحب کی خدمت میں پہنچائیں گے۔ نورالدین تاجر چرم گوجرانوالہ

(زمیندار لاہور ۱۶ جنوری ۱۹۱۱ء)

نورالدین صاحب کا ایک اور مراسلہ علامہ شبلی کی وفات کے بعد شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے علامہ شبلی کی وفات اور سیرت نبوی کی عدم تکمیل پر اظہار افسوس کیا ہے۔ نیز سیرت کی

تکمیل کے لئے مولانا سید سلیمان ندوی کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پر ملال سے مسلمانوں کو وہ ناقابل برداشت نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔ مبداء فیاض نے علامہ مرحوم و مغفور کی ذات مجتمع صفات شتی بنائی تھی۔

لیس من اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد
آپ عالم و فاضل و شاعر و مورخ و فلسفی و متصوف و ادیب و فقیہ و محدث و محقق و مقنن و متکلم تھے۔ بلاشبہ آپ کا وجود اس قدر فضائل و اوصاف حمیدہ کا جامع تھا کہ ان میں ایک کے ساتھ بھی اگر کوئی فرد متصف ہو تو اس کے فضل و کمال کے واسطے کافی ہو سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ علامہ مرحوم و مغفور کی ذات ستودہ صفات ہمارے وصف نام تمام سے مستغنی ہے۔ کیوں کہ آپ کی تصنیفات و تالیفات نے صفحہ عالم پر آپ کا دوام ثابت کر دیا ہے۔ افسوس و اندوہ تو اس بات کا ہے کہ مسلمانوں کی بد قسمتی سے ابھی سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم نام تمام ہے۔ علامہ مدوح خلد بریں کو تشریف لے گئے۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تدوین و تالیف اسلام کی آخری لیکن اہم و اقدم خدمت تھی، جس میں مرحوم و مغفور دو تین سال سے منہمک تھے۔ اور اس کی تکمیل کا آپ کو اس قدر شغف تھا کہ بیماری کے دنوں میں بھی آستانہ نبوت سے غیر حاضر رہنا گوارا نہیں کر سکتے تھے بلکہ اخیر وقت تک سیرت کی نامتومی کا رنج و قلق اور اس کی تکمیل کی توجہ آپ کی زبان پر تھی۔

سیرت نبوی کی ضرورت صرف تاریخی حیثیت سے ہی نہیں ہے بلکہ زیادہ تر عقائد کی حیثیت سے ہے۔ جدید تعلیم یافتہ گروہ کو اردو میں کوئی مستند سیرت نہیں ملتی تو وہ مجبوراً انگریزی کتابوں کا جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں، مطالعہ کرتا ہے۔ اس میں ذرا بھی شائبہ شبہ نہیں کہ یہ کتابیں اغلاط و اسقام اور تعصبات سے مملو ہیں کیوں کہ وہ ان مخالفین اور معاندین کی لکھی ہوئی ہیں جو اسلام اور قرآن سے محض بے گانہ اور بالکل نا آشنا ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے سخت نقصان ہوتا ہے۔ قارئین کے عقائد متزلزل ہو جاتے ہیں اور اسلام اور داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت ان کو سوء ظنی پیدا ہوتی ہے۔ علامہ مرحوم و مغفور نے اس ضرورت کو محسوس کر کے ادارہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم قائم کیا جس کے واسطے ضروری کتب سیر و احادیث، ہم پہنچائیں اور دیگر تمام ضروریات کا تہیہ کیا اور خود ہمہ تن سیرت کی تدوین و ترتیب میں مصروف ہو گئے۔ اس ادارہ کے

مصارف تمام و کمال علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال اپنی معمولی فیاضی و کرم گستری سے ادا فرماتی ہیں۔ اللہ متع المسلمین بطول حیاتہا۔ سیرت کا پہلا حصہ تو مکمل ہو گیا ہے اور غالباً زیر طبع ہے لیکن دوسرا حصہ ابھی نا تمام ہے اور اسی حصہ میں علامہ مغفور کی تحقیق و تدقیق اور علم و فضل کے جوہر کھلنے والے تھے مگر نہایت رنج و حسرت کا مقام ہے کہ قوم کی بد قسمتی سے علامہ کو قبل از وقت داعی اجل کو بلید کہنا پڑا اور مسلمانوں کی بے شمار آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔

اب سوال یہ ہے کہ سیرت کی تکمیل کیوں کر ہو سکتی ہے؟..... تؤدوا الامانات
السی اہلہا اس بار امانت کے اٹھانے کے اہل مولانا السید سلیمان صاحب ندوی پروفیسر بڑودہ کالج ہیں جن کو خود علامہ مرحوم و مغفور وصیت فرما گئے ہیں کہ سب کام چھوڑ کر سیرت کی تکمیل کریں۔ اس بنا پر قرعہ فال سید صاحب کے نام ہی پڑتا ہے۔ سید صاحب میں کمال علم و فضل کے علاوہ بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ علامہ ہی کے رنگ میں رنگین ہیں۔ جن صاحب کو سید صاحب کے مضامین پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے جو الہند وہ اور دیگر وسائل و جرائد میں چھپتے رہے ہیں، وہ اس بات کا اعتراف کریں گے کہ سید صاحب کی تحریر و طرز استدلال بالکل علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے موافق و مطابق ہے۔ سید صاحب کو علامہ مرحوم و مغفور کی روحانی تربیت کا فخر بھی حاصل ہے اور مثل مشہور ہے کہ اگر پدر نتواند پدر تمام کند اس بنا پر یقیناً کاذا نام اہل اسلام کی توقع کہ مولانا السید سلیمان صاحب سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکمیل فرمائیں گے کسی دن واقعہ ثابت ہوگی۔ و ما ذالک علی اللہ بعزیز۔ (نور الدین تاجر چرم از گجرانوالہ)

وفد سیرت نبویؐ

روزنامہ زمیندار ۱۳ دسمبر ۱۹۱۴ء میں اس وفد سے متعلق بھی ایک مراسلہ شائع ہوا ہے جو بیگم سلطان جہاں کی خدمت میں گیا تھا۔ اس مراسلہ سے بعض اہم باتوں کا انکشاف ہوتا ہے، مثلاً علامہ شبلی کی وفات کے بعد بیگم بھوپال نے منشی محمد امین زبیری جنہوں نے بعد میں ذکر شبلی لکھی، اعظم گڑھ بھیجا تھا اور وفد سیرت نبوی انھیں کے ہمراہ بھوپال گیا تھا۔ اس وفد میں مولانا حمید الدین فراہی بھی شامل تھے۔ مراسلہ یہ ہے:

مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی خبر سے تمام ہندوستان متاثر تھا۔ ہر ہائینس بیگم صاحبہ بھوپال جن کی قومی محبت اور مذہبی جوش محتاج بیان نہیں ہے بے حد متاثر ہوئیں۔ سیرت کے متعلق مولانا کا مشہور قطعہ تھا:

غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل

کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطان ہے

بیگم صاحبہ نے بعد حسرت فرمایا کہ فقیر بے نوا تو چل بسا، سلطان بھی پابہ رکاب ہے۔ بیگم صاحبہ چونکہ سیرت نبوی کے مصارف ماہانہ کی متکفل تھیں، انھیں سب سے پہلے اس کی فکر ہوئی کہ آئندہ کے لئے کیا سامان ہوگا؟ اور اس کی دریافت کے لئے فوراً منشی محمد امین صاحب مہتمم صیغہ تاریخ بھوپال کو اعظم گڑھ روانہ کیا۔ یہاں آکر مولانا نے اپنے آخری انفس زندگی میں تکمیل سیرت نبوی کے لئے جو سامان کیا تھا اس سے ان کو بھی اطمینان ہو گیا اور بغرض مزید اطمینان مولانا حمید الدین صاحب و سید سلیمان صاحب کو لے کر ۲۷ نومبر کو خود بیگم صاحبہ کی خدمت میں بھوپال روانہ ہوئے۔ ۲۸ نومبر کی صبح کو ساڑھے دس بجے ہر ہائینس بیگم صاحبہ نے وفد سے ملاقات فرمائی۔ اول مولانا نے مرحوم کی وفات پر افسوس ظاہر کیا اور آئندہ کے لئے کام کے جاری رکھنے کی تاکید فرمائی۔ دوران گفتگو میں وفد سے مختلف مذہبی، قومی اور اصلاحی معاملات پر بحث فرماتی رہیں۔ تفسیر قرآن جو مولانا حمید الدین صاحب عربی میں لکھ رہے ہیں اور سیرت عائشہ و نساء الاسلام وغیرہ تصنیفات جو سید سلیمان کے زیر تالیف و نظر ہیں، ان کی تکمیل و ترجمہ انگریزی کا اشتیاق ظاہر کیا۔ دارالمصنفین و دیگر تجاویز علمی کی امداد و اعانت کے لئے متعدد بار تذکرہ فرمایا۔ سیرت نبوی کے اسٹاف کے لئے دو سو کی ماہانہ امداد بھوپال سے جاری تھی بدستور مدت باقیہ کے لئے سرکار عالیہ نے جاری رکھنا منظور فرمایا۔ (دفتر سیرت نبوی۔ شبلی منزل، اعظم گڑھ)

برگ گل

علامہ شبلی کی وفات کے بعد مولوی حاجی معین الدین قدوائی ندوی نے علامہ مرحوم کے اخیر دور کے فارسی کلام کو جمع کر کے برگ گل کے نام سے شائع کیا۔ روزنامہ زمیندار میں انھوں

نے یہ اپیل شائع کرائی کہ علامہ مرحوم کا کلام جن اہل علم کے پاس ہو وہ اس مجموعہ میں شامل کرنے کی غرض سے روانہ فرمائیں۔

پنجاب ریویو

پنجاب ریویو نومبر دسمبر ۱۹۱۳ء کے شمارے کی زمیندار میں فہرست شائع کی گئی ہے۔ اس فہرست میں علامہ شبلی کا بھی ایک مضمون ہے۔ عنوان ہے ”فوجی زندگی کا اثر شاعری پر“ یہ بڑی اہم اطلاع ہے۔ اس لئے کہ علامہ شبلی کا مذکورہ مضمون مقالات شبلی کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں، پنجاب ریویو کا مذکورہ شمارہ دستیاب ہو جائے تو کتابیات میں علامہ شبلی کے ایک اہم مضمون کا اضافہ ہوگا۔

غرض روزنامہ زمیندار لاہور میں علامہ شبلی کی تحریروں کے ساتھ ان کی سیرت و شخصیت اور کارناموں پر مختلف النوع تحریریں شائع ہوئی ہیں، ان کی تصنیفات خاص طور پر سیرۃ النبی کا متعدد بار تذکرہ آیا ہے۔ اس کی اہمیت و عظمت کا ذکر بھی اہل شوق نے یا ہے۔ علاوہ ازیں زمیندار کی تحریروں سے علامہ شبلی کی اس دور کی سرگرمیوں کا بھی پورے طور پر ادراک ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی کی تدوین میں اس کو سامنے رکھا۔ واقعہ یہ ہے کہ زمیندار کے مشمولات شبلی کے مطالعہ کے بغیر سوانح شبلی کی تکمیل نہیں ہو سکتی ہے۔ اس کا مطالعہ بے حد اہمیت کا حامل ہے۔

کتابیات

کتب

- ۱۔ آثار شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۲۰۱۳ء
- ۲۔ آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی، حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۵۸ء
- ۳۔ اردو ادب کے ارتقا میں تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ، ڈاکٹر منظر اعظمی، اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۹۶ء
- ۴۔ اشخاص و افکار، ضیاء الحسن فاروقی، مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۷۳ء
- ۵۔ الانتقاد، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، طبع جدید
- ۶۔ الفاروق، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء
- ۷۔ المامون، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۲ء
- ۸۔ باقیات شبلی، مشتاق حسین، آزاد کتاب گھر دہلی، ۱۹۶۴ء
- ۹۔ حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء
- ۱۰۔ خاطرات، ظفر حسن ایبک، سنگ میل پبلی کیشن لاہور ۱۹۹۰ء
- ۱۱۔ خطبات شبلی، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۰ء
- ۱۲۔ سر سید اور ان کے نامور رفقا، ڈاکٹر سید عبداللہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۴ء
- ۱۳۔ سر سید کی صحافت، پروفیسر اصغر عباس، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۲ء
- ۱۴۔ سفر نامہ روم و مصر و شام، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۱ء
- ۱۵۔ سیرۃ النبی جلد اول، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، طبع جدید ۲۰۰۳ء
- ۱۶۔ سیرۃ النعمان، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۹ء

- ۱۷۔ شبلی مخنوروں کی نظر میں، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء
- ۱۸۔ کلیات شبلی اردو، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۷ء
- ۱۹۔ متعلقات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء
- ۲۰۔ مضامین الندوہ، مرتبہ ابوسلمان شاہ جہاں پوری، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۰۷ء
- ۲۱۔ مقالات شبلی جلد سوم، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۵۵ء
- ۲۲۔ مقالات شبلی جلد چہارم، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۵۶ء
- ۲۳۔ مقالات شبلی جلد ششم، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۵۱ء
- ۲۴۔ مقالات شبلی جلد ہشتم، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۷۲ء
- ۲۵۔ مکاتیب شبلی جلد اول، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء
- ۲۶۔ مکاتیب شبلی جلد دوم، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء
- ۲۷۔ مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، عبداللطیف اعظمی، شبلی اکادمی دہلی، ۱۹۳۵ء
- ۲۸۔ وضاحتی کتابیات، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، ۱۹۸۰ء

رسائل

- ۲۹۔ الہلال کلکتہ۔ ایڈیٹر: مولانا ابوالکلام آزاد
- ۳۰۔ الہلال مصر۔ ایڈیٹر: جرجی زیدان
- ۳۱۔ البلاغ کلکتہ۔ ایڈیٹر: مولانا ابوالکلام آزاد
- ۳۲۔ لسان الصدق کلکتہ۔ ایڈیٹر: مولانا ابوالکلام آزاد، مرتبہ ابوسلمان شاہ جہاں پوری، مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کراچی ۱۹۹۶ء
- ۳۳۔ لسان الصدق کلکتہ۔ ایڈیٹر: مولانا ابوالکلام آزاد، مرتبہ عبدالقوی دسنوی، مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۸۸ء
- ۳۴۔ زمیندار لاہور۔ ایڈیٹر: مولانا ظفر علی خاں



Price : ₹ 250/-